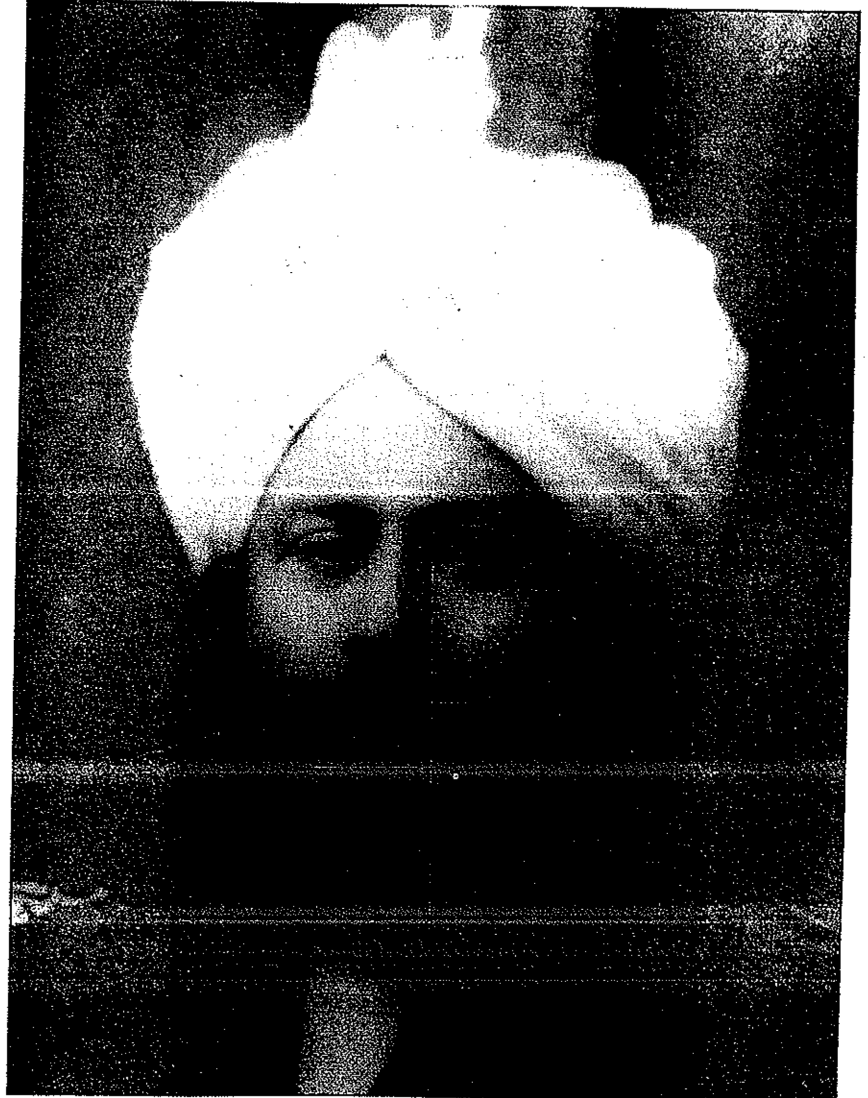
ربوہ کی چند پرانی یادیں



ربوہ رہے کعبہ کی بڑائی کا دُعا گو
ربوہ کو پہنچتی رہیں کعبہ کی دُعائیں

سیّد حسن خان

بانیٔ ربوہ



حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد المصلح الموعود خلیفۃ المسیح الثانی ؓ

﴿گذارشات﴾

میرے مضمون "ربوہ کی چند پرانی یادیں" کے اختتام پر اسکی درستیاں کروانے کے لئے مناسب شخصیت کی ضرورت پیش آئی تو میرے ذہن میں چند احباب کے نام آئے جن میں مکرم ومحترم منیر الدین صاحب شمس ایڈیشنل وکیل التصنیف یوکے کو میں نے زیادہ مناسب سمجھا۔ اس غرض کے لئے جب میں نے جناب منیر الدین صاحب شمس کی خدمت میں اپنی خواہش ظاہر کی تو آپ نے بخوشی قبول کرلیا۔

لہٰذا آپ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے میرے مضمون کی نہ صرف درستیاں کیں بلکہ اپنی قیمتی نصائح سے بھی نوازا۔ اسطرح اس مضمون کی اشاعت کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

مزید یہ کہ آنمحترم نے ربوہ سے تشریف لائے ہوئے ناظر اشاعت صدر انجمن احمدیہ ربوہ مکرم سید عبدالحیٔ صاحب کی خدمت میں بھی اس مسودہ کو منظوری کے لئے پیش کیا۔ جس کو مکرم شاہ صاحب نے ازراہِ شفقت قبول کیا اور بڑی محنت اور اخلاص سے نہ صرف اس کی مزید درستیاں کیں بلکہ اس مضمون کے بارہ فرمایا: "مضمون میں نے پڑھ لیا ہے اور ضروری درستیاں بھی کردی ہیں مضمون قابل اشاعت اور دلچسپ ہے"۔

خاکسار مکرم ومحترم منیر الدین صاحب شمس ایڈیشنل وکیل التصنیف اور جناب محترم سید عبدالحیٔ شاہ صاحب کا انتہائی ممنون ہے کہ آپ دونوں نے میرے ساتھ بڑی ہی شفقت کا سلوک کیا ہے۔ اور ناچیز کی حقیر کوششوں کو قبول فرماتے ہوئے اس مضمون کو چار چاند لگادیئے ہیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

آخر میں میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو اس کام کا اجر عظیم عطا فرمائے اور دنیا و آخرت کی حسنات سے نوازے۔ آمین

والسلام

خاکسار

سید حسن خان مچم سرے یو کے

مکرم محترم فرید احمد ناصر (مربی سلسلہ احمدیہ)
اور مکرم محترم نور احمد عابد صاحب کی خدمت میں خاکسار
کی طرف سے ناچیز تحفہ۔ اُمید ہے آپ پڑھ کر ضرور
محظوظ ہونگے۔ طالب دعا۔
سید حسن خان۔ یوکے
0751012819

﴿تعارف﴾

گذشتہ دنوں برادرم مکرم سید حسن خان صاحب نے مجھ سے ذکر کیا کہ انہوں نے ربوہ کے متعلق اپنی بعض پرانی یادیں قلمبند کیں ہیں اور مجھے بھی دکھانا چاہتے ہیں تاکہ میری رائے بھی پتہ کرسکیں۔ حسن خان صاحب کے ساتھ ہم کرکٹ کے میچ کھیلا کرتے تھے اور ان کو میں بچپن سے جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے ایک سنجیدہ مگر خوش اخلاق نوجوان کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ چونکہ میں ربوہ میں ہی پیدا ہوا اور میرا بچپن، تعلیم کا زمانہ اور پھر جوانی کا ابتدائی حصّہ (انگلستان میں 1973 میں بحیثیت نائب امام مسجد فضل لندن تقرری تک) ربوہ میں گزرا اسلیئے طبعاً میں نے فوراً حامی بھرلی کہ میں مسودہ کو ضرور پڑھونگا اور اگر کوئی بات قابل غور ہوئی اسکی نشاندہی کردونگا۔

جب میں نے مسودہ پڑھنا شروع کیا تو مجھے تعجب ہوا کہ حسن صاحب نے ربوہ کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی یاد رکھی ہوئی ہیں اور یوں لگا جیسے وہ ربوہ کے چپّہ چپّہ سے واقف ہیں۔ مجھے بہت سی ایسی باتوں کا پتہ چلا جن سے پہلے مجھے واقفیت نہیں تھی۔ ان میں ربوہ کی پہاڑیوں کے مختلف انداز، ربوہ کے نمایاں گڑھے اور ربوہ کے ٹیلوں کے متعلق تو میں نے اپنے آپکو انجان ہی محسوس کیا۔

اس کتاب میں حسن صاحب نے ربوہ کی بارشوں اور آندھیوں وغیرہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اور ربوہ میں کھیلی جانے والی کھیلوں کے متعلق جو لکھا ہے، اسے پڑھ کر پرانی یادیں۔۔ بچپن کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ کن کن مسائل کا سامنا ہوا کرتا تھا اور کتنی مشکلات ہوتی تھیں لیکن انہیں یاد کر کے حقیقۃً لطف محسوس ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ ایک خواب سا لگتا ہے۔ اُس وقت لوگ بھی اپنے تھے اور ایک جنت کا سا سماں ہوتا تھا۔ نمازوں کے وقت نماز، کھیلوں کے وقت کھیل، پڑھائی کے وقت پڑھائی اور آرام کے وقت آرام ہوتا تھا۔ اب تو ربوہ میں دوسروں نے بھی بسیرا کیا ہوا ہے۔ یہانتک کہ اسکا نام بھی چناب نگر رکھ دیا ہے۔ لیکن زیرنظر کتاب میں حسن صاحب نے پرانے زمانے کی یادیں جمع کیں ہیں اور بڑی

عمدگی سے جمع کیں ہیں۔ حقیقۃً اسے پڑھکر انسان اُن یادوں میں کھو جاتا ہے جو ہمارے بچپن یا جوانی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

حسن صاحب نے اپنے محلّہ کی چند بزرگ شخصیتوں اور بعض دوکانداروں کے بارہ میں بھی لکھا ہے، جسے پڑھ کر ان سب کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ کاش ربوہ کے دیگر بزرگوں کے بھی حالات جمع کئے جائیں تا کہ ہماری نسلوں کو اُن بزرگوں کے حالات سے بھی علم ہو سکے۔

بہر حال زیرِ نظر کتاب کو میں نے بہت دلچسپ پایا ہے اور بعض الفاظ کو "مزہ" اور "دلچسپی" کیلئے اُسی طرح رہنے دیا ہے جیسے حسن صاحب نے لکھا ہے مثلاً کانے اور ٹرخانا وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ حسن صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہم سبکو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنا جائزہ لینے والے ہوں کہ ہمارے بزرگوں نے کن حالات میں گزارا کیا اور پھر اسکے بدلہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسقدر فضلوں کا وارث بنایا ہے۔ ہم جتنا بھی اُسکا شکر ادا کریں، کم ہے۔ اے کاش سب یہ حقیقت جان کر اُسی کے در پر جھکنے والے ہوں کہ:

سب کچھ تیری عطا ہے، گھر سے تو کچھ نہ لائے

خاکسار

منیر الدین شمس

ابن خالد احمدیت حضرت مولانا جلال الدین صاحب شمسؓ

9 /10/ 2 002

فہرست مضامین

ربوہ کی چند پرانی یادیں

Rabwah ki Channd Poraani Yadain

First published in UK in 2003

Printed in UK at

Raqeem Press

"Islamabad"

Sheephatch Lane

Tilford, Surrey GU10 2AQ

United Kingdom

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   نحمدہٗ و نُصلّی علیٰ رسولہِ الکریم

{ربوہ کی چند پرانی یادیں}

"دیباچہ"

اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کی دی ہوئی طاقت سے اس کمزور اور نااہل انسان کو اس بڑے اور مشکل ترین مضمون کو مکمل کرنے کی توفیق ملی۔ الحمدللہ علیٰ ذالک

یہ خاکسار کا دوسرا مضمون ہے اس سے قبل خدا تعالیٰ نے "افغانستان کی سرزمین" پر مضمون لکھنے کی توفیق بخشی جو کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے دوستوں میں کافی مقبول ہوا۔ اور پھر "انصاراللہ ربوہ" میگزین کی زینت بھی بنا۔ الحمدللہ

خاکسار کا اس مضمون کو اپنی یادداشت کے مطابق ربوہ کے ابتدائی ایّام کے بارہ، اپنے محلّہ کی چند بزرگ ہستیوں کے بارہ اور زیادہ تر اُن غریب الوطن دکانداروں کے بارہ میں تحریر کرنا مقصود ہے جنہوں نے اس بے آب وگیاہ بستی کو بسانے میں دکھ اور تکلیفیں جھیلیں۔ اِن دکانداروں کی مسلسل اور دن، رات کی کوششوں کے پھل اب آج اس قصبہ میں بسنے والے کھا رہے ہیں۔ نیز چند چیدہ چیدہ احباب کا ذکرِ خیر کرنا میرا اوّلین مقصد ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ ہر احمدی، خواہ وہ ربوہ کا رہنے والا ہے یا کسی اور جگہ کا وہ اس مضمون سے ضرور محظوظ ہوگا۔

خاکسار نے جب اس مضمون کو لکھنے کے بارے، ربوہ کے چند دوستوں سے اپنی منشاء ظاہر کی تو میں نے ان سب کے چہروں پر ایک خوشی اور بشاشت محسوس کی۔ جس سے خاکسار کے دل میں اس

مضمون کو لکھنے کا مزید شوق پیدا ہوا اور حوصلہ بھی بڑھا۔ نیز دل سے یہ دُعا نکلی کہ مولیٰ کریم مجھ ناچیز کو اس اہم اور انتہائی مشکل مضمون کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین

خاکسار نہ تو کوئی ناول نویس اور نہ ہی مضمون نگار ہے۔ دل میں ایک جوش اور تمنا تھی جس نے اس ناچیز کو ایسے مشکل مضمون کو مکمل کرنے کی توفیق دی۔ خاکسار نے اپنی یادداشت کے مطابق اُس زمانہ کی ہر اُس کیفیت اور واقعہ کو زیرِ قلم لانے کی کوشش کی ہے جو مجھے یاد تھا۔ اس کے علاوہ اپنے مضمون کی تکمیل کے لئے ربوہ کے بارہ میں چند ضروری حوالہ جات میں نے محترم کیپٹن ملک خادم حسین صاحب مرحوم کی کتاب ''ربوہ'' سے حاصل کئے ہیں۔ مگر یہ بھی میں جانتا ہوں کہ پھر بھی کئی ایسی باتیں ضرور تشنہ رہ گئی ہونگیں جن کو میں اپنی تحریر میں نہ لا سکا ہونگا۔ آخر میں خاکسار اُمید کرتا ہے کہ جتنا بھی لکھا گیا ہے قارئین کے لئے دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا موجب ہوگا۔

والسلام طالبِ دعا

خاکسار سید حسن خان

مچم سرے یو کے

ربوہ کے ابتدائی حالات اور اس کا پسِ منظر

سرزمینِ ربوہ کا انتخاب:

۱۹۴۷ء کے آخر میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے تحت حضرت نوا محمد دین صاحب نے چوہدری اسد اللہ خانصاحب کی معیت میں یہ رقبہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ واقعی یہ حضور کی ۱۹۴۱ء کی رؤیا کے مطابق ہے۔ اسی دوران میں ایک دفعہ حضور سرگودھا تشریف لے گئے ایک کار میں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے ہمراہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب مدظلہ العالی اور حضرت نواب دین صاحب تھے اور دوسری کار میں راجہ علی محمد صاحب پنشنز افسر مال، چوہدری اسد اللہ خانصاحب ا شیخ محمد دین صاحب مختار عام۔ راستہ میں حضور نے قریباً دو گھنٹہ تک اس رقبہ کو دیکھا اور فرمایا:

''جو جائے پناہ خواب میں دیکھی تھی، یہ پہاڑیاں اور ظاہری علامات خواب کی مطابق ہیں۔ مگر یہ جگ ایسی سرسبز نہیں۔ ممکن ہے ہماری کوششوں سے یہ جگہ سرسبز ہو جائے''

چنانچہ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی منظوری کے بعد حضرت نواب محمد دین صاحب نے صوبائی حکومت سے یہ جگہ خریدنے کے لئے بات چیت شروع کر دی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے تصفیہ ہونے کے بعد اس سرزمین جلد ہی قبضہ مل گیا۔

ریونیو ریکارڈ میں یہ موضع ''چک ڈھگیاں'' کے نام سے موسوم ہے۔

(بحوالہ 'ربوہ' از کیپٹن ملک خادم حسین صاحب مرحوم آف ربوہ)

حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک ارشاد ربوہ کے بارہ میں:

''یہ کبھی وہم نہ کرنا کہ ربوہ اُجڑ جائے گا۔ ربوہ کو خدا تعالیٰ نے برکت دی ہے۔ ربوہ کے چپہ چپہ پر اللہ اکبر کے نعرے لگے ہیں۔ ربوہ کے چپہ چپہ پر محمد ﷺ پر درود بھیجا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ اس زمین کو کبھی ضائع نہیں کرے گا جس پر نعرۂ تکبیر لگے ہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجا گیا ہے۔ یہ بستی قیامت تک خدا تعالیٰ کی محبوب بستی رہے گی اور قیامت تک اِس پر برکتیں نازل ہوں گی۔ اس لئے

یہ کبھی نہیں اُجڑے گی، کبھی تباہ نہ ہوگی۔ بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ کا جھنڈا دنیا میں کھڑا کرتی رہیگی'' انشاء اللہ تعالیٰ۔

(الفضل نمبر ۶۳۔ ۷ ۱۹۵ء مرتبہ جناب کیپٹن ملک خادم حسین صاحب مرحوم آف ربوہ ۱۹۶۲ء)

''داغِ ہجرت''

الہام حضرت مسیح موعود علیہ السلام ۱۸ ستمبر ۱۸۹۴ء

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک ارشاد:

'' انبیاء کے ساتھ ہجرت بھی ہے۔ لیکن بعض رؤیا نبی کے زمانہ میں پورے ہوتے ہیں اور بعض اولاد یا کسی متبع کے ذریعہ سے پورے ہوتے ہیں۔ مثلاً آنحضرت ﷺ کو قیصر و کسریٰ کی کنجیاں ملی تھیں تو وہ ممالک حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتح ہوئے ''

(بدر جلد نمبر ۲۳، ۷ ستمبر ۱۹۰۵ء)

۱۹۴۷ء برصغیر ہندو پاک کی تاریخ میں قیامتِ کبریٰ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سال انتقال اقتدار کی وجہ سے جب کروڑوں افراد کا تبادلہ ہوا اور فتنہ وفساد کی آگ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف پھیل گئی۔ بالخصوص مشرقی پنجاب کے نہتے مسلمانوں پر ایسے انسانیت سوز مظالم توڑے گئے جن کے تصوّر سے بھی روح کانپ اُٹھتی ہے۔ رفتہ رفتہ قتل وغارت کے شعلوں نے جماعت احمدیہ کے دائمی مرکز قادیان کے نواح کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے جب دیکھا کہ مشرقی پنجاب میں رہ کر اشاعتِ اسلام کا کام جاری رکھنا ناممکن ہے تو آپ قادیان سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور یوں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا الہام ''داغِ ہجرت'' پورا ہوا۔

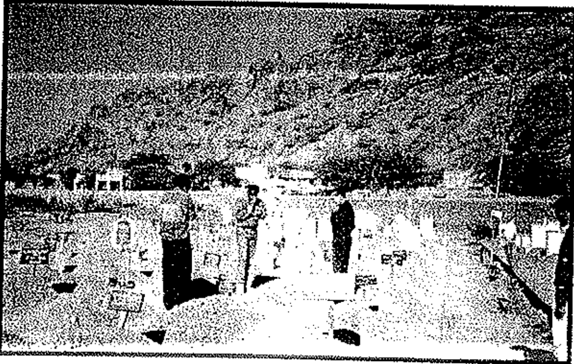
نئے مرکز یعنی ربوہ کا نام:

''۱۶ ستمبر ۱۹۴۸ء کورتن باغ لاہور میں ایک میٹنگ میں نئے مرکز کے لئے ماوٰی، ذکریٰ، دارالہجرۃ اور مدینۃ المسیح وغیرہ نام پیش کیے گئے۔ آخر میں حضرت مولانا جلال الدین صاحب شمس نے (قریشی عبدالرشید صاحب بی اے سابق وکیل المال کی روایت کے مطابق) ربوہ کا نام تجویز کیا جو حضرت مصلح موعودؓ نے منظور فرمایا اور ۲۰ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اس کا اعلان فرمادیا۔''

(بحوالہ 'ربوہ' جناب کیپٹن ملک خادم حسین صاحب مرحوم آف ربوہ)

ربوہ کا تاریخی پسِ منظر:

محلِ وقوع کے لحاظ سے ربوہ دریائے چناب کے مغربی کنارے پر واقع ہے جہاں شرقاً وغرباً پھیلی ہوئی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ پایا جاتا ہے۔ کچھ پہاڑیاں آبادی کے درمیان واقع ہیں اور باقی ربوہ کے شمال میں ایک قدرتی فصیل بناتی ہوئی دریا کے اُس پار چنیوٹ کی طرف چلی جاتی ہیں۔ دریا دو تنگ درّوں سے گزرتا ہے۔ ان دروں پر دو دوہرے پل بنے ہوئے ہیں۔ نیچے سے ریل گزرتی ہے اور اوپر سے چھکڑے اور لاریاں۔ یہ دونوں پل ایک احمدی انجینئر خان بہادر نعمت اللہ خان صاحب مرحوم کی زیرنگرانی ۱۹۲۸ء میں مکمل ہوئے۔ اب یہ پل زیادہ قابلِ استعمال نہیں رہے۔

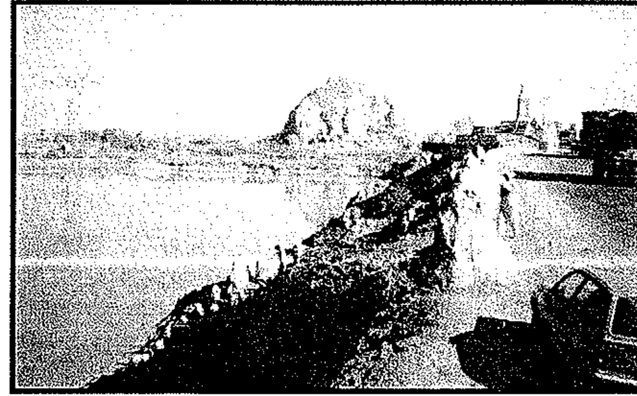


ربوہ سے دو میل شمال مغرب کی طرف سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سے قصبہ احمد نگر ہے۔ یہ قصبہ آج سے سینکڑوں سال قبل اس علاقہ کے ایک سردار احمد خان نے آباد کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں اس قصبہ کی حیثیت ایک گونہ صوبائی دارالحکومت کی تھی۔ دریائے چناب پرانے وقتوں میں اس کے نزدیک بہتا تھا جو کسی نامعلوم وجہ سے اپنی گزرگاہ تبدیل کر کے پہاڑیوں کے درمیان بہنے لگ گیا۔

سرزمین ربوہ کے ملحقہ کھنڈرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود غزنوی کے حملوں سے بہت پہلے یہاں کوئی شہر

آباد تھا جس پر کسی زمانہ میں مغرب کی طرف سے پانی چڑھ آیا، اور دریا کے دوسرے دھارے نے پہاڑیوں کے مشرق کی جانب سے ہوکر اس شہر کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ لوگ سراسیمگی کے عالم میں اس جزیرے سے نکل گئے اور شہر کھنڈرات میں تبدیل ہوکر رہ گیا۔

اس امر کا سراغ لگانا قریباً ناممکن ہے کہ کس راجہ کے عہد میں یہاں کوئی فوجی چھاؤنی قائم تھی یا کون لوگ آباد تھے یا کس زمانہ میں یہ شہر برباد ہوا۔ البتہ اس آبادی کا تعلق چنیوٹ کے ساتھ ضرور معلوم ہوتا ہے جو لاہور ملتان اور بھیرہ کی طرح بہت پرانا شہر ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس شہر کی قدامت کا جو عوام میں انہیری کے نام سے مشہور ہے، کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔



"جب مغرب کی طرف سے دریائے چناب نے اپنی گزرگاہ تبدیل کر کے پہاڑیوں کے درمیان بہنا شروع کر دیا تو اس کے بعد شہر انہیری بدستور ویران رہا اور اس جگہ کوئی آبادی نہ ہو سکی۔ لیکن تاریخی لحاظ سے اس مقام کو ایک اور خصوصیت حاصل ہو گئی۔ یعنی یہ جگہ مشرق سے مغرب کی طرف سے آنے جانے والے قافلوں کے لئے آسان ترین گزرگاہ بن گئی۔ پہاڑیوں کی وجہ سے سیلاب کے دنوں میں بھی یہاں کشتی رانی کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دریا کے کسی دوسرے حصہ میں اتنا محفوظ اور آرام دہ پتن نہیں پایا جاتا، اس لئے چنیوٹ والے پتن کو لوگ شاہی پتن کہتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔"

(بحوالہ ماخوذ 'ربوہ' از کیپٹن ملک خادم حسین صاحب مرحوم آف ربوہ پاکستان)

ربوہ میں آنیوالا پہلا قافلہ:

ابتدائی حالت میں یہاں بسنے والے ۳۵ افراد تھے۔ ان کے لئے سڑک کے کنارے خیمے لگائے گئے۔ ان پینتیس (۳۵) افراد میں مندرجہ ذیل دوست شامل تھے:

"چوہدری ظہور احمد صاحب، چوہدری عزیز احمد صاحب بی اے، مولوی تاجدین صاحب جمعدار چوہدری فضلدین صاحب، چوہدری عبدالرحیم صاحب چیمہ، راجہ محمد نواز صاحب، مرزا عبدالحمید صاحب، چوہدری محفوظ الرحمٰن صاحب، چوہدری میر احمد صاحب، محمد شفیع صاحب اسلم، سردار نور احمد صاحب، اللہ بخش صاحب پہرہ دار، خوشی محمد صاحب، اللہ رکھا صاحب، صوفی نورداد صاحب، غلام احمد صاحب، احمد دین صاحب گجراتی اور فرزند علی صاحب۔"

(بحوالہ 'ربوہ' از کیپٹن ملک خادم حسین صاحب مرحوم ومغفور آف ربوہ)

ربوہ میں پہلی رات:

مکرم چوہدری عبدالسلام صاحب اختر ایم اے مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

۱۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو شام کے سات بجے کے قریب ہمارا ٹرک جس میں چھولداریاں، خیمہ جات اور سائبان وغیرہ لدے ہوئے تھے، اس سرزمین میں پہنچ گیا جسے اللہ تعالیٰ نے پاکستان میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا مرکز بنایا تھا۔

اس ٹرک میں ڈرائیور اور دو مزدوروں کے علاوہ میں اور مکرم مولوی محمد صدیق صاحب فاضل تھے۔ چناب کے پل کے نگران سپاہی اور کچھ راہگیر جو شام کے بعد اس سڑک سے خال خال ہی گزرتے ہیں حیران ہو کر ہمیں دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کے فضل سے ہم نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ ٹرک میں سے اپنا سامان اتارنے میں مصروف رہے۔ جب تمام سامان اتارا جا چکا تو ڈرائیور اور مزدور رخصت کر دیئے گئے۔ اُس وقت میلوں تک علاقہ بالکل ویران اور سنسان حالت میں ہمارے سامنے تھا۔ دائیں طرف بڑی سڑک تھی جس پر رات کو ٹریفک کلیتہً بند

ہو جاتا تھا اور بائیں طرف ریلوے لائن تھی جو پہاڑوں کے بیچ میں سے چکر کاٹتی ہوئی ایک طرف چنیوٹ اور دوسری طرف سرگودھا کو چلی جاتی ہے مگر رات کو کوئی گاڑی یہاں سے نہیں گذرتی تھی۔

میں نے سامان اُس جگہ اتارا جو میرے آقا سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ (رضی اللہ تعالیٰ۔ناقل) نے تجویز فرمائی تھی۔ اگلے دن حضور مع خدام تشریف لانے والے تھے، اس لئے ہم نے خیمے حضور کی آمد سے پہلے نصب کرنے تھے۔ مگر اس جنگل میں پہلی رات کا تصور کچھ خوف کچھ لذت پیدا کر رہا تھا۔ خوف تو اس بات کا تھا کہ اس علاقہ میں سانپ، بچھو، گیدڑ اور بعض اوقات بھیڑیا بھی پایا جاتا ہے۔ مگر اس سے بہت زیادہ شیریں کیفیت تھی جو اس خیال سے پیدا ہو رہی تھی کہ یہی وادی غیر ذی زرع ایک دن ہجوم خلائق کا مرکز بننے والی ہے چنانچہ ہم دونوں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اسنے محض اپنے فضل سے ہمیں سب سے پہلے آبادکاروں میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائی --------- اور ہم نے فیصلہ کیا کہ اس زمین پر سب سے پہلا خیمہ بغیر مزدوروں کی مدد کے اپنے ہاتھ سے لگایا جائے۔ چنانچہ میں نے اور مولوی محمد صدیق صاحب نے ایک چھولداری کو درست کیا اور بغیر کسی کی مدد کے اس میدان کے وسط میں چھولداری اپنے ہاتھ سے لگائی۔ اس کے بعد ہم نے مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کیں۔

یہ خیمہ ربوہ کی سرزمین پر پہلا خیمہ تھا جس کے نصب کئے جانے کی سعادت قادیان کے دور ہنے والوں کو نصیب ہوئی۔ فالحمد للہ"

(الفضل ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۸ء بحوالہ 'ربوہ' از کیپٹن ملک خادم حسین صاحب)

قمر الانبیاء حضرت صاحبزادہ میرزا بشیر احمد صاحبؓ ایم اے اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں

"۲۰ ستمبر ۱۹۴۸ء کو یعنی بروز پیر (دوشنبہ) یہ ابتدائی افتتاح وقوع میں آ گیا اور حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے وہاں جا کر ایک مجمع کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی۔ اس موقعہ پر ایک وسیع شامیانہ اور کچھ خیمے نصب کر دیئے گئے، چنیوٹ اور احمد نگر اور لالیاں اور سرگودھا کے علاوہ کئی دوست

لاہور سے بھی اس بابرکت تقریب میں شامل ہونے کے لئے پہنچ گئے تھے۔ نماز ظہر ڈیڑھ بجے شروع ہوئی جس میں تقریباً اڑھائی صد احباب شریک تھے۔

اس کے بعد شریک ہونے والے احباب کی فہرست تیار کی گئی اور پھر حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت درجہ مؤثر اور درد سے بھری ہوئی تقریر کے بعد حاضرین کے ساتھ لمبی دُعا کی۔ اس دُعا کے بعد برکت کے خیال سے پانچ بکرے ذبح کئے گئے۔ جن میں ایک اس رقبہ کے وسط میں ذبح کیا گیا اور چار چار کونوں میں ذبح کئے گئے۔ وسط والا بکرا خود حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے مسنون دُعاؤں کے ساتھ اپنے ہاتھ سے ذبح فرمایا۔ اس کے بعد تھوڑے سے وقفہ سے اسی مقام پر جہاں شامیانے کے نیچے نمازِ ظہر ادا کی گئی تھی عصر کی نماز پڑھی گئی۔ جس میں کچھ اوپر پانچ سو احباب نے شرکت کی۔ اور بعض مستورات بھی جو اس وقت تک وہاں پہنچ چکی تھیں پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر نماز میں شامل ہوئیں۔ نماز کے بعد کھانا کھایا گیا جس کے لئے چنیوٹ کے دوستوں نے انتظام کیا تھا اور پھر ۴ بج کر ۴۰ منٹ پر حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ لاہور کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔ اس غیر معمولی تقریب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس برکت سے نوازہ کہ قربانیوں کے بعد اور عصر کی نماز سے پہلے ایک نوجوان نے جو ترکستان سے آئے ہوئے ہیں حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس طرح یہ خوش قسمت نوجوان (محمد افضل ترکی) نئے مرکز کا پہلا پھل قرار پایا گیا"۔

(حوالہ 'ربوہ' از کیپٹن ملک خادم حسین صاحب مرحوم)

ربوہ کی تعمیر:

پہلا وہ دور جس میں ربوہ ایک نوزائیدہ بستی تھی اور اس کی تعمیر بھی ابھی اپنے پہلے مرحلہ میں تھی ۔اس وقت انجمن کی طرف سے وقتی طور پر کچی آبادیاں تعمیر کرنے کا حکم صادر ہوا تھا۔ لٹے پھٹے احمدیوں نے جہاں بھی اور جیسے بھی ہوا اپنے سر چھپانے کے لئے اپنے طور پر کچے پکے مکانات تعمیر کرنے شروع کردئے۔ باقی بے ڈھبی زمین کو قابلِ رہائش بنانے کے لئے حضرت مصلح موعودؓ کی فرمودہ ہدایات کے تحت باہمی وقارِ عمل اور دُعاؤں کے ذریعہ ربوہ کو قابلِ رہائش بنایا جانا شروع ہوگیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب احمدیت کے پروانے ادھر آ آ کر بسنے شروع ہوئے تو پھر ربوہ دن بدن بہتر سے بہتر ہوتا چلا گیا۔ الحمدللہ

غالباً ۱۹۵۲ یا ۱۹۵۳ء میں پھر انجمن کی طرف سے ربوہ کے کچے مکانات کو گرا کر پکے مکانات تعمیر کرنے کا حکم صادر ہوا۔

ربوہ کی تعمیر کا پہلا مرحلہ:

ربوہ کی تلاش میں حضرت مصلح موعودؓ کی معیت میں ایک قافلہ لاہور سے ربوہ کی سرزمین پر سب سے پہلے پہنچا۔ اُس قافلہ میں دو کاریں شامل تھیں۔ ایک کار میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ تھے۔ اور دوسری کار میں مکرم شیخ محمد دین صاحب مرحوم، نواب محمد دین صاحب مرحوم اور چودھری اسداللہ صاحب مرحوم تھے۔ وہ سرزمین جو نشأۃ ثانیہ کا دوسرا مرکز بننے والی تھی۔ یہ سرزمین چنیوٹ سے سات میل پرے واقع ہے اور جائے وقوع کے لحاظ سے سرگودھا اور لائل پور (فیصل آباد) کے عین وسط میں ہے۔ یعنی اس سے قریباً ۲۸ میل جنوب مشرق میں لائل پور اور قریباً ۲۸ میل شمال مغرب میں سرگودھا واقع ہے۔ یہ جگہ پہلے ''انہیری'' کے نام سے مشہور تھی پھر پاکستان کے نئے نقشہ میں ''چک ڈھگیاں'' کے نام سے موسوم تھی۔ (بحوالہ ''ربوہ'')

یہ سرزمین ایک بنجر شورزدہ اور بے آب و گیاہ تھی جس کو پاکستان کی حکومت نے ایک بالکل

ناکارہ اور نااہل قرار دیا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس سرزمین کی قیمت ڈالنا بھی گوارہ نہ کیا۔ جس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ یہ سرزمین نا تو کھیتی باڑی کے لئے کارآمد ثابت ہوسکتی تھی اور نا ہی آبادی کے لائق قرار دی جاسکتی تھی۔ ربوہ کی پرانی تاریخ کے مطابق اس جگہ کو آباد کرنے کی کئی دفعہ کوششیں بھی کی گئیں مگر بے سود۔ مگر یہ توفیق خدا تعالیٰ نے ایک الٰہی جماعت کو دینی تھی اور دی۔ جس جماعت کا سربراہ ایک موعود خلیفہ تھا جس کو خدا کی تائید اور نصرت حاصل تھی نیز جس کے ساتھ احمدیت کے پروانے شامل تھے جن کے عزائم پہاڑوں سے بھی بلند تھے۔ ان کا عزم یہ تھا کہ ہم نے اس سرزمین کو آباد کرنا ہے اور یہی ان کا گھر اور یہی ان کا ٹھکانہ ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ان کو پیش آنے والی پہاڑ جیسی مشکلات کو عبور کرنا مقصود تھا۔

سب سے پہلے پانی کا مسئلہ تھا۔ پانی کے حصول کے لئے حضرت مصلح موعودؓ نے ہر طرف خدام دوڑائے کہ کہیں سے پانی تلاش کیا جائے۔ مگر پینے کے پانی میں کامیابی نہ ہوئی۔ پھر حضرت مصلح موعودؓ نے اپنے خدا کے حضور دعائیں کیں ساتھ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابہ کرام اور مومنین کی دعاؤں سے آپؓ کو الہاماً پانی کی موجوگی کی خوشخبری دی گئی۔ تب آپؓ نے ایک ایسی جگہ پر کھدائی کی تاکید فرمائی جہاں سے خدا کے فضل سے میٹھا پانی نکل آیا۔ وہ جگہ مرزا منور احمد صاحب کے گھر کے سامنے والے چوک پر واقع ہے۔ یہاں پر آپؓ نے ٹیوب ویل لگوانے کا حکم صادر فرمایا۔ اس طرح پانی کچھ حد تک ربوہ کی ضرورتوں کے لئے کافی ہونے لگا۔

اس ٹیوب ویل کی جگہ پر آپ کا ایک الہامی شعر بھی نصب ہے۔

جاتے ہوئے حضور کی تقدیر نے جناب
پاؤں کے نیچے سے مرے پانی بہادیا

(حضرت مصلح موعودؓ)

اس کے بعد مختلف دیگر جگہوں پر بھی کوششیں کی گئیں جہاں سے نلکوں کے ذریعہ مناسب حد

تک پانی مہیا ہونے لگا۔

لیکن پہاڑیوں کے اردگرد اور گول بازار اور اس کے گردونواح میں تو پانی اتنا کڑوا ہوتا تھا کہ اس پانی کو پینا تو کجا اس سے کپڑے بھی دھونا مشکل ہوتا تھا۔ مگر ہمارے محلّہ یعنی محلّہ دارالرحمت غربی اور وسطی محلّہ کا پانی کسی قدر بہتر تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے پہلے اور کچے گھر میں کوئی نلکا نہیں ہوتا تھا لہٰذا ہم کبھی کبھار نزدیکی ریلوے سٹیشن سے سٹیم انجن کے ڈرائیور کی منت سماجت کر کے پانی لاتے جسے گھر کے کام کاج میں استعمال کرتے تھے جو کہ زیادہ تر کپڑے دھونے اور نہانے کے طور پر کام آتا تھا۔

میرے نانا جان سید احمد نور کابلیؓ نے ہمارے گھر کی ضروریات کے لئے ایک مقامی سقّہ لگوایا ہوا تھا جن کا نام نواب دین صاحب تھا۔ وہ بھی ایک عجیب شخصیت کے مالک تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ہم سب گھر والے کہیں باہر گئے ہوئے تھے تو سقّہ صاحب مرحوم جب پانی کی مشک لائے تو ہمیں گھر میں نہ پا کر ہمارے گھر کی ایک چھوٹی سی کھڑکی سے ساری مشک پھینک کر چلے گئے جب ہم گھر واپس آئے تو کمرہ میں پانی ہی پانی پا کر جب ہم نے ان سے دریافت کیا تو کہنے لگے کہ تم لوگ گھر پر نہیں تھے تو پھر میں کیا کرتا۔ میں نے اس لئے پھینک دیا کہ آپ کو معلوم ہو کہ میں نے آپ کا پانی کسی کو نہیں دیا بلکہ آپ ہی کے گھر پھینک دیا ہے۔ یہ بھی ایمانداری کی ایک عجیب مثال ہے۔

چونکہ صدیوں سے یہاں پر پانی یا تو ہوتا ہی نہ تھا یا پھر استعمال کرنے والا کوئی نہ تھا لہٰذا اس جگہ پر جنگلی جھاڑیوں اور خشک گھاس کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ سوائے ایک درخت کے جو کہ سٹیشن کے پاس بڑا سا تھا یا سڑک کے درے کے پاس کیکر کے چند درخت ہوا کرتے تھے۔ جہاں پر پانی کے چھوٹے موٹے گڑھے ہوا کرتے تھے۔ ورنہ ربوہ کی سرزمین کے اندر میرے خیال کے مطابق کوئی درخت نہ تھا اور نا ہی کوئی سبزہ۔ جگہ جگہ جھاڑیاں اُگی ہوئی ہوتی تھیں۔ یہ جنگلی جھاڑیاں اتنی بھیانک ہوتی تھیں کہ پاس جاتے بھی ڈر لگتا تھا۔ یہ زیادہ تر کانٹے دار ہوتیں اور کہیں کہیں کانے والی لمبی لمبی ٹیالی قسم کی

جھاڑیاں اُگی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بھی ہوتی تھیں جن کو غالباً بوجھے کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ربوہ کی زمین ویران اور اجاڑ تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ربوہ کے احمدیوں نے مختلف قسم کے درخت اور سبزیاں لگانے شروع کئے۔ مجھے خوب یاد ہے ہمارا کچا مکان، جو کہ ریلوے سٹیشن کے قریب ہوا کرتا تھا گھر کے باہر ہم نے کچھ سبزیاں اُگائی ہوئی تھیں۔ ان کیاریوں کے اردگرد کانٹوں کی باڑ گیدڑوں وغیرہ سے محفوظ رہنے کے لئے لگائی تھی۔ کیونکہ ان دنوں گیدڑ بھیڑیئے اور لومڑیاں رات کے وقت عام دندناتی پھرتی تھیں۔ ان جانوروں کے خوف سے ہم راتوں کو ڈر کے مارے گھروں کے اندر دُبکے رہتے تھے۔ پہلے پہل تو ربوہ میں رات کے وقت اکیلے گھر سے باہر نکلنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ گھر سے باہر رات کے اندھیرے میں ہزاروں بلائیں پھرا کرتی تھیں۔ اور جنگلی جھاڑیوں سے سانپ، بچھو اور بے شمار کئی قسم کے زہریلے کیڑے مکوڑے باہر نکل آیا کرتے تھے۔ رات کے وقت عموماً نزدیکی پہاڑیوں سے گیدڑ، لومڑیاں اور بھیڑیئے نکل کر آبادیوں کی طرف آجاتے۔ اسی طرح بعض اوقات نزدیکی دیہات سے جنگلی سؤر بھی آجایا کرتے اور گھروں سے باہر کی چھوٹی موٹی کیاریاں اُجاڑ دیا کرتے تھے۔

جہاں تک نزدیکی پہاڑیوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں ذرا تفصیل سے بعد میں 'ربوہ کی پہاڑیاں' میں ذکر کرونگا۔ لیکن ضمناً میں بتاتا چلوں کہ صدیوں پرانے یہ پہاڑ انتہائی خوفناک تھے۔ ان پہاڑیوں کے بارہ اس وقت بیان کرنا کہ یہ کتنی وحشت ناک تھیں مشکل ہے۔ بہشتی مقبرہ کے پاس والا درّہ انتہائی تنگ گذر اور خطرناک ہوتا تھا۔ پہلے تو درّہ سے گذرنے کے لئے پہاڑ پر چڑھنا ہی کافی دشوار تھا نیز یہ درّہ بھی خاصا اونچا لگتا تھا۔ اس کے بعد درّہ کی دوسری جانب یعنی کوٹ امیر شاہ کی طرف اُترنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہوتا تھا۔ اب نہ تو وہ درّہ رہا اور نہ ہی اس کے ساتھ کی پہاڑیاں کیونکہ ان کو توڑ کر پاکستان میں موٹروے بنوائی گئی ہے۔

ربوہ کے ابتدائی ایام کے موسم اور ربوہ کے شب و روز

بارشیں اور آندھیاں

بارشیں:

جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ربوہ کے ابتدائی ایام میں چونکہ اکا دُکا (ٹاواں ٹاواں) مکانات تھے اور انسانی زندگی کا آغاز اس سرزمین پر ہزاروں سال کے بعد ہو رہا تھا لہٰذا یہاں کا موسم بھی بے ڈھنگا سا تھا۔ اوّل تو بارشیں ہوتی نہیں تھیں اگر شروع ہوتیں تو گرج اور چمک کے ساتھ موسلا دھار ہوتیں اور چند ہی منٹوں میں جل تھل کر دیتیں۔ بادل اتنے گھنے اُٹھا کرتے کہ برسنے سے پہلے ہی دہشت مچا دیتے۔ کالے سیاہ بادل عموماً شمال مغرب (سرگودھا) کی جانب سے اُٹھتے اور جلد ہی سارے ربوہ پر چھا کر پوری گڑگڑاہٹ کے ساتھ موٹے موٹے قطروں کی بارش شروع کر دیتے جس سے سارے ربوہ میں ایک ترتھلّی مچ جایا کرتی۔ وہ اس لئے کہ مکانات کچے اور عارضی سے بنے ہوئے تھے بارش شروع ہوتے ہی مکانات ٹپکنے شروع ہو جاتے اور اگر بارش رات کے وقت ہوتی تو اور بھی عذاب بن جایا کرتی۔ گرمیوں میں لوگ باہر سوئے ہوتے تو فوراً اٹھ کر کمروں کی طرف بھاگتے، اندر جاتے تو بارش کا پانی کمروں سے ٹپک رہا ہوتا تھا۔ پھر فوراً مکان کی چھت پر چڑھ کر مٹی ڈالتے۔ بس ایسے ہی اندر باہر جاتے صبح ہو جایا کرتی تھی۔ مگر سردیوں میں تو اس سے بھی زیادہ تکالیف اُٹھانی پڑتیں۔ باہر بارش ہو رہی ہوتی اور اندر مکان ٹپک رہے ہوتے تھے جس سے کمرے کی ہر چیز گیلی ہو جایا کرتی تھی۔ عجیب ہی حالات تھے۔ مگر ایک چیز ضرور تھی کہ اس وقت ہمارے حوصلے بہت بلند تھے اور ہر تکلیف کو خوشی خوشی قبول کرتے تھے۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہم اکیلے اس حالت سے نہیں گذر رہے بلکہ اس وقت سارا ربوہ ہمارے ساتھ اس کیفیت سے گذر رہا ہے۔ صبح ہوتی تو دیکھتے کہ بارش کا پانی باہر کے جوہڑوں میں بھرا ہوا ہوتا تھا جس میں بے شمار مینڈک ٹریں ٹریں کر کے غبارے نکال رہے ہوتے نظر آتے۔ ہم حیران

ہوا کرتے کہ یہ ڈڈو کہاں سے اتنی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں۔

ایک دفعہ کا واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا جبکہ ظہر کی نماز میں مسجد ناصر میں پڑھ رہا تھا اتنے میں باہر بادلوں کی گڑگڑاہٹ شروع ہوئی اور نماز کے ختم ہونے پر باہر دیکھا تو بارش اپنے زوروں پر تھی اور ساتھ اتنے بڑے بڑے اولے پڑ رہے تھے کہ اتنے حجم کے اولے میں نے کبھی زندگی میں نہیں دیکھے۔ اس سے ہم سب نمازی مسجد میں ہی کچھ دیر کے لئے بند ہو کر رہ گئے۔ جب بارش ذرا تھمی تو ہمیں باہر نکلنے پر معلوم ہوا کہ تانگہ بانوں کے گھوڑے بدک بدک جاتے تھے اور ساتھ کے دکانداروں کے چھپروں میں جا جا گھستے تھے کیونکہ وہ سمجھتے کہ ان کا مالک انہیں سونٹے مار رہا ہے۔ مزید یہ کہ ان اولوں کے نشانات کئی سال تک ربوہ کے میدانوں میں پڑے رہے۔

آندھیاں:

آندھیاں اتنی شدید اور کالی سیاہ آیا کرتیں کہ خُدا کی پناہ، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ جو کہ پھر سارے ربوہ میں تباہی اور افراتفری مچا دیا کرتیں، کسی کے گھر کی چھت اُڑ جاتی تو کسی کے گھر کی اشیاء اور برتن ہوا میں اڑ جایا کرتے۔ آندھی کے تھم جانے کے بعد لوگ اپنی اپنی اشیاء ڈھونڈا کرتے۔ زیادہ تر دودھ دہی والے اس تباہی کا شکار ہوا کرتے تھے۔ آندھی سے سارا گھر ریت سے بھر جاتا اور کھانے پینے کی تمام اشیاء میں ریت پڑ جایا کرتی۔ آندھیاں بھی بارشوں کی طرح شمال کی جانب سے اُٹھا کرتی تھیں۔ بعض اوقات یہ ہوتا کہ آندھی آئی تو پھر وہ ربوہ کا پیچھا نہ چھوڑتی پلٹ پلٹ کر ربوہ کا رُخ کیا کرتی۔ آندھیاں بارشوں سے زیادہ آیا کرتی تھیں۔ اس وقت ربوہ کیا تھا ایک امتحان گاہ تھا۔ ربوہ کو آباد کرنے کی ذاتی کوششوں کے علاوہ حضرت مصلح موعودؓ کی دن رات کی دُعائیں، نیز صحابہ کرام حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور سب احمدیوں کی دُعائیں بھی شامل تھیں۔ ربوہ کے پُر آشوب حالات ایک لمحہ کے لئے بھی اس بستی کے مکینوں کو نا اُمید نہ کر سکے۔ میں نے اپنی زندگی میں یہ نہیں سنا کہ کوئی احمدی ان حالات کی وجہ سے ربوہ کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہو۔ نہیں بلکہ آئے دن نئے احمدی آ کر بستے ہیں

نے دیکھے۔ اس وقت ہمیں خوشی یہ تھی کہ یہ جگہ ہماری ہے اور ہم نے اس کو ہر حالت میں آباد کرنا ہے اور ہر تنگی اور مشکل کو خوشی خوشی، صبر اور تحمل سے برداشت کرنا ہے۔ اس بستی کا ایک ایک فرد خواہ بچہ ہو یا بوڑھا یا عورت سب اپنے اپنے طور پر اس کو آباد کرنے میں کوشاں نظر آتا تھا۔

ربوہ کی آندھیوں کے بارہ میں ایک ایسا ہی واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ ایک دفعہ غلہ منڈی (دارالرحمت غربی) کا میرو ڈبہ کا میچ الف محلّہ سے پڑ گیا۔ وہ ایسے کہ مسجد مبارک میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم سب اکٹھے ہو کر الف محلّہ پہنچے۔ میچ شروع ہو گیا۔ ابھی میچ شروع ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ سرگودھا (شمال مغرب) کی جانب سے ایک کالی گھٹا اٹھتی ہوئی مجھے نظر آئی میں نے محسوس کر لیا کہ یہ آندھی کوئی زیادہ ہی خطرناک لگتی ہے۔ اس کا ذکر میں نے اپنے ساتھیوں سے کیا مگر ان سب نے مجھ سے اس وقت اتفاق نہ کیا۔ بلکہ مجھے ڈرپوک کہہ کر ٹرخا دیا۔ مگر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ آندھی یقیناً خطرناک ہے، ضرور کوئی رنگ لائے گی۔ بہرحال ابھی چند منٹ ہی گذرے ہونگے کہ وہ کالی گھٹا ہمارے گھروں کی طرف سے آسمان پر اٹھنی شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا چھانا شروع ہو گیا اور ابھی ہم سب سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ یہ کالی بلا سارے ربوہ پر چھا گئی۔ پھر کیا تھا ایسی افرا تفری مچی کہ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی کہ وہ کہاں ہے۔ ڈر کے مارے سب نے میدان سے اپنے اپنے گھروں کو دوڑیں لگانی شروع کر دیں۔ اپنے بارہ مجھے یہ معلوم ہے کہ میں کس مصیبت سے ریلوے لائن کو پکڑتے پکڑتے اپنے گھر کے قریب ریلوے سٹیشن پہنچا تھا۔ اس وقت ریلوے سٹیشن چھوٹا سا ہوا کرتا تھا۔ جب ریلوے سٹیشن پہنچا تو اُس کے آگے مجھے یاد نہیں کہ میں اپنے گھر تک کیسے پہنچا۔ اگلے دن پھر مجھے میرے دوستوں، یحیٰ محمد، سلیم احمد، منہاج النبی (مُنّی) تعظیم، اور بشیر احمد اعوان وغیرہ نے اپنے اپنے واقعات بیان کئے کہ کیسے کیسے وہ پھر بعد میں گھر پہنچے۔

ربوہ کے ابتدائی ایام کی آندھیوں کا اس وقت اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ مگر کسی میرے ہمعصر سے پوچھا جائے تو وہ ضرور مجھ سے اتفاق کریگا کہ اُس وقت آندھیاں واقعی بہت خطرناک آیا

کرتی تھیں۔ آندھیوں کے بارے تو بہت سے واقعات مجھے یاد ہیں مگر اس وقت ان سب کا ذکر کرنا مضمون کو طول دینا ہے۔

بہرحال ربوہ وہ زمین تھی جس کو حکومتِ پاکستان نے اپنے نقشہ میں ایک ناکارہ اور ہر طرح سے نااہل قرار دیا ہوا تھا۔ نہ تو اس زمین میں کھیتی باڑی ہو سکتی تھی اور نہ ہی کوئی آبادی کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہ ایک الٰہی جماعت کی کوششیں اور صبر اور تحمل تھا جس سے یہ سرزمین آباد ہوئی۔ دشمن ہم پر ہنستا تھا اور اس تاک میں تھا کہ کب یہ قوم سخت نا اُمید ہو کر اس جگہ سے بھاگ جاتی ہے اور ہمیں پھر ان پر استہزا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ آتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب ہم کبھی چنیوٹ خرید و فروخت کے لئے جاتے تو یہ بے وقوف لوگ ہم پر ہنستے کہ تم لوگ پاگل ہو گئے ہو جو اس فضول قسم کی سرزمین میں آ بسے ہو۔ مگر ہمارے عزم کا ان جاہلوں کو کیا علم تھا۔ اب آج یہی چنیوٹ والے للچائی نظروں سے ادھر آ بسنے کے لئے بہانے بناتے ہیں اور کئی آ بھی بسے ہیں۔ اسی طرح اور قریبی گاؤں والوں کا حال ہے، لالیاں، سرگودھا اور ساتھ کے گاؤں والے اب اسی شہر ربوہ سے روابط رکھتے ہیں تا کہ ان کو کچھ نفع ہو سکے اور امن ڈھونڈنے ادھر ہی آتے ہیں نیز اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ربوہ ہی کے اسکولز اور کالج میں آتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے ربوہ کے وہ ابتدائی ایام جبکہ صدیوں پانی کو ترسی اس سرزمین میں سوائے جگہ جگہ ٹیلے اور اس بنجر زمین میں نہ کوئی پودا تھا نہ کوئی درخت ہاں ایک درخت تھا جو کہ اب بھی ریلوے سٹیشن کے قریب ہے۔ کوئی سایہ تک نہ تھا جس کے نیچے بیٹھ کر بلا کی گرمی کی دھوپ سے بچاؤ کیا جا سکے۔ جگہ جگہ سرکنڈوں کے خشک بوجھے تھے جو کہ زرا ہوا چلتی تو اُڑ اُڑ کر لوگوں کے گھروں میں جا گھستے بس وہ ہی نظارہ جو کہ عموماً امریکہ کی ہولی وڈ کی ویسٹرن فلموں میں نظارے دکھائے جاتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو یہ فلمیں میں بڑے شوق سے دیکھتا ہی اس وجہ سے ہوں کہ ان فلموں میں مجھے ربوہ کا نظارہ نظر آتا ہے۔ وہی بوجھے تیز ہواؤں سے اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بہرحال حالات سخت مخدوش اور

تکلیف دہ تھے۔ ایک طرف گرمی عذاب کی دوسری طرف سایہ اور پانی کی کمی۔ آبادی کی کمی کی وجہ سے آندھیاں اور طوفان عذاب بنکر نازل ہوتے۔ عجیب قسم کی حالت تھی۔ اُس وقت کی حالت کا تو اب صحیح احساس ہوتا ہے مگر اس وقت تو ایک شُغل میلا ہی لگتا تھا۔

الحمدللہ۔ قصرِ خلافت کے قریب ٹیوب ویل لگنے سے پانی کا مسئلہ بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے کسی حد تک پورا ہونے لگا۔ ٹیوب ویل سے پانی لیکر ماشکی احمدیوں کے گھروں تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ مشک کا تھوڑا سا پانی تو بمشکل پینے اور کھانا پکانے کے لئے کافی ہوا کرتا تھا اور کپڑے دھونے اور نہانے کے لئے کافی مشکل پیش آیا کرتی تھی۔ جس کے لئے نزدیکی نلکے وغیرہ سے ضرورت پوری کی جاتی تھی۔ یا جیسا کہ خاکسار پہلے بیان کر آیا ہے کہ ریلوے انجن والے کی منت سماجت کر کے باقی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پانی حاصل کیا جاتا تھا۔ دارالصدر محلّہ اور بہشتی مقبرہ اور عام قبرستان کی پہاڑیوں کے قریب کے علاقوں میں اور کالج کے قریبی علاقوں کا پانی سب سے کڑوا ہوتا تھا۔ مگر جب ہم غلہ منڈی اور فیکٹری ایریا کے قریب آتے تو پانی کافی میٹھا اور ذائقے دار تھا۔ یہاں پر انجمن کی طرف سے ایک ٹیوب ویل بھی لگوایا گیا ہے۔ اور اس کے قریب اب حضور اقدس کی اجازت سے ایک سویمنگ پول بنا دیا گیا ہے۔ بلکہ اب تو یہاں پر ربوہ کی سب سے بڑی نرسری بھی لگائی گئی ہے جہاں سے ہزاروں اقسام کے پودے سارے ربوہ میں پہنچائے جاتے ہیں۔

پانی کے مسئلہ کے بعد سب سے بڑا مسئلہ کھانے پینے کی اشیاء کی خرید و فرخت کا تھا۔ ربوہ کے دکاندار کھانے پینے کی اشیاء، یعنی سبزیاں اور ضروری اشیاء عموماً ربوہ کے قریبی قصبوں، لالیاں، چنیوٹ اور سرگودھا وغیرہ سے خرید کر لاتے اور پھر ربوہ میں فروخت کرتے۔ دودھ، انڈے اور مرغیاں اور بڑا اور چھوٹا گوشت وغیرہ عموماً قریبی قصبوں سے یعنی چھنیاں، ڈاور، چمن عباس اور احمد نگر اور قریبی گاؤں سے خرید کر لاتے۔ بعض دودھی جن میں خلیل احمد صاحب، جلال پلو صاحب مرحوم اور باؤ صاحب مشہور ہیں۔ یہ لوگ اپنی سائیکلوں پر قریبی گاؤں میں جا کر دودھ کے بڑے بڑے کنٹینرز سا

ئیکلوں پر دونوں اطراف میں لٹکائے لاتے اور بڑی محنت سے پھر دکانداروں اور لوگوں کے گھروں میں فروخت کرتے۔ اس وقت کی ان لوگوں کی قربانیوں کو بھلایا نہیں جاسکتا۔

باقی جہاں تک گیس اور بجلی کا تعلق ہے یہ تقریباً 1953ء کے بعد ربوہ میں آئی اور گیس ۱۹۶۹ میں۔ اس سے قبل جو حالات تھے وہ مجھے ابھی تک یاد ہیں جبکہ شروع شروع میں آگ جلانے کے لئے ہم کہاں کہاں سے اور کن مشکلوں سے لکڑیاں اٹھا کر کے گھر والوں کو مہیا کیا کرتے تھے۔ جب ربوہ کے گردونواح میں جھاڑیوں وغیرہ کی کمی ہوگئی تو پھر ہم پہاڑوں سے جھاڑیوں کی جڑیں کاٹ کر لاتے اور گھر والوں کو دیتے کہ وہ جلانے کے لئے استعمال کریں۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ بعض لوگوں نے لکڑی کے ٹال لگائے جہاں سے ہم لکڑیوں کی ضرورت پوری کرتے تھے۔ نیز بعض جگہوں پر آٹا پینے کی چکیاں بھی لگ گئیں جن میں ایک ہمارے محلّہ غلّہ منڈی میں بھی لگی جو کہ چوہدری فرزند علی صاحب مرحوم کی تھی جس کو بعد میں نعیم احمد صاحب حال کینیڈا ابھی کافی عرصہ چلاتے رہے۔ ایک چکی اور ٹال ہمارے نئے (پکے) گھر کی پچھلی جانب جہاں اس وقت سویمنگ پول بنا ہوا ہے۔ جس کے مالک عبدالستار صاحب تھے نے لگائے۔ بہر حال پہلے پہل ربوہ میں گیس اور بجلی نہ ہونے کی وجہ سے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ربوہ والوں کے حوصلے ماشاء اللہ بہت بلند تھے۔ اور سب سے بڑی بات اتفاق تھا اور باہمی پیار و محبت تھا جس کی بناء پر ہم لوگوں نے دن رات کی کوششوں سے اس کو رہنے کی جگہ بنایا اور جس کا پھل آجکل کے مکین پا رہے ہیں۔ دوسرے ربوہ کی تعمیر میں ہمیں حضرت مصلح موعودؓ کی سربراہی حاصل تھی جن کو دن رات خدا تعالیٰ کی تائید حاصل تھی۔ مصلح موعودؓ کی گاہے بگاہے کی نصائح ہر وقت شامل حال رہتی تھیں ورنہ یہ تو ایسی جگہ تھی جس کو تو حکومت بھی آباد نہ کرسکی۔

ربوہ میں سب سے پہلے رہائش کا مسئلہ اور اس کا حل

نیز روزمرّہ کے حالات

سب سے پہلے بعض لٹے پھٹے مستحقین کی رہائش کے لئے مختلف جگہوں پر عارضی طور پر بیرکوں کے بنانے کا منصوبہ عمل میں لایا گیا۔ کچھ بیرکیں ریلوے لائین کے اس پار جہاں پر کرنل حیات صاحب مرحوم کی کوٹھی اور حضرت چودھری ظفر اللہ خان صاحب مرحومؓ کی کوٹھی ہے اور ریلوے لائن کے بلکل قریب۔ اور کچھ ریلوے سٹیشن کے پاس جہاں اِس وقت دار الضیافت کی عمارت ہے اور حضرت اماں جانؓ کا یادگاری کمرہ موجود ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سب سے پہلا میرا پرائمری اسکول انہی بیرکوں میں تھا۔ جو کہ پھر جلد ہی دار الرحمت وسطی میں منتقل ہوگیا تھا۔ ان بیرکوں کے علاوہ کچھ احمدیوں نے اپنے کچے مکانات بھی تعمیر کر لئے تھے۔ بیرکوں کے قریب جلسہ سالانہ کے دنوں میں مہمانوں کے استعمال کے لئے آبخورے اور پیالے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ سٹیشن کی جانب آئیں تو اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا ڈاک خانہ بھی تھا۔ ریلوے سٹیشن کے بڑے درخت کے بالکل پاس ایک بھٹی بھی تھی جس کو ہمارے ربوہ کے نامور کبڈی کے کھلاڑی محمد دین صاحب عرف ''کگا'' مرحوم کے والدین احمدیوں کی ضروریات کو پورا کرنے لئے چلایا کرتے تھے۔ ریلوے سٹیشن کے بلکل سامنے غالباً سب سے پہلا لنگر خانہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ جو کہ صرف جلسہ سالانہ کے ایام میں استعمال کیا جاتا تھا۔ جس میں ایک بہت ہی پیاری ہستی، یعنی میرے اُستاد مکرم و محترم مولوی محمد یٰسین صاحب آف چکوال ضلع جہلم مرحوم رہائش پذیر تھے۔ جن کے بارے میں مختصراً حالات آئندہ صفحات میں لکھونگا۔ اس لنگر خانہ کے بالکل مقابل پر کچا بازار تھا اور ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی جس کے قریب مکرم خدا بخش زیروی صاحب مرحوم کا گھر تھا۔

مجھے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ میرے پیارے نانا جان تاریخِ احمدیت کی ایک مشہور ہستی حضرت سید احمد نور صاحب کابلیؓ شاگردِ خاص حضرت شہزادہ سید عبد الطیف شہیدؓ آف افغانستان کا جنازہ اسی مسجد میں 1952 میں پڑھا گیا تھا۔

بیرکوں کے علاوہ بھی احمدیوں نے اپنے طور پر مکانات تعمیر کرنے شروع کر دیئے۔ جن میں میرے نانا جان سید احمد نور کابلیؓ نے تین کمروں کا ایک گھر تعمیر کروایا ریلوے سٹیشن کے قریب ریلوے لائن کے اِس طرف تھا جہاں دار الرحمت غربی اور غلہ منڈی واقع ہے۔ ہمارے گھر کے ساتھ اور احمدیوں نے بھی کئی کچے گھر بنائے جن میں ہمارے بہت ہی عزیز ہمدرد اور پیار کرنے والے وجود آبسے تھے جن کی اس وقت بھی میرے دل میں بہت قدر اور عزت باقی ہے۔ وہ احباب بھائی رمضان صاحب مرحوم جن کا ایک بیٹا جس کا نام سلیمان احمد صاحب ہے اس وقت ماشاء اللہ جرمنی میں برسرِ روزگار ہے۔ اب بھائی رمضان کے بیٹے نے ماشاء اللہ ربوہ میں ایک بہت بڑی کوٹھی تعمیر کروائی ہے جن کی اُس وقت ایک چھوٹی سی کھڈی ہوا کرتی تھی۔ دوسرے بھائی محمد طفیل ہوتے تھے جن کا پیشہ قلعی گری تھا۔ ان کے ایک بیٹے کا نام ۔۔۔ تھا اور لالہ رحمت اللہ صاحب افغانی مرحوم تھے جو سبزی فروش تھے جن کے بیٹے رفیق اللہ صاحب اس وقت غالباً ربوہ میں مقیم ہیں، کا گھر تھا۔ ان سب کے علاوہ اور بھی ساتھ ساتھ کئی مکانات تھے۔ ان کے ساتھ ریلوے روڈ پر کچھ دودھ دہی والوں کی دکانیں تھیں ایک تنور تھا جو کہ بابا چراغ دین صاحب مرحوم کا تھا۔ نیز اور بھی کئی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ اس چھوٹے سے ماحول میں بے حد پیار اور اخلاص تھا۔ سب ایک دوسرے سے پیار و محبت سے ایک کنبہ کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ ہمارے گھر کے ساتھ ریلوے لائن کے قریب تین چار گڑھے ہوا کرتے تھے کچھ ریلوے لائن کے اس طرف اور کچھ اُس طرف۔ جن میں بارشوں کے موسم میں پانی بھرا رہتا تھا۔

ریلوے سٹیشن کے قریب چند کچے مکانات تھے جہاں اس وقت غیر احمدیوں نے مسجد تعمیر کی ہوئی ہے۔ ان گھروں میں عموماً ربوہ کے تمام حجام رہا کرتے تھے۔

ربوہ کے گردونواح میں۔ کوٹ امیر شاہ، ڈاور، چھنیاں، لالیاں اور احمد نگر دیہات واقع ہیں۔ جن کے ساتھ ہمارے کافی روابط تھے۔ جہاں سے ہمارے اس زمانہ کے دکاندار دودھ مکھن، انڈے مرغیاں، بھیڑ بکریوں کے لئے چارہ اور سبزیاں وغیرہ لا کر ربوہ میں بیچا کرتے تھے۔ ان چھوٹے

چھوٹے دیہات میں جا کر ہم شکار بھی کیا کرتے تھے۔اس وقت ان جگہوں کے لوگ بہت شریف النفس تھے۔ہم سے بڑے اخلاص اور پیار سے پیش آیا کرتے تھے۔پھر بعد میں فتنہ پرست ملانوں کی باتوں میں آ کر کچھ علاقوں میں ہماری مخالفت بھی شروع ہو گئی۔مگر ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق کے زمانہ میں تو حد ہی ہو گئی۔چمن عباس جو کہ غلام عباس صاحب کی زمین ہے۔جن کا شیعہ مسلک سے تعلق ہے۔اُدھر ہم بے دھڑک جایا کرتے تھے۔محرم کے دنوں میں تو ہم ان کے ذاکروں کے وعظ سنتے اور پیٹتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔بلکہ سید غلام عباس شاہ صاحب کے ایک بیٹے نے تو ہمارے اسکول اور کالج سے تعلیم بھی حاصل کی تھی۔باقی انہی علاقوں سے چور اور ڈاکو ربوہ میں آ کر چوریاں بھی کیا کرتے تھے۔ان کا چوری کرنا تو ایک مشغلہ ہے۔ایک گاؤں والے دوسرے گاؤں کی گائیں بھینسیں اور بکریاں چرا لاتے تو دوسرے گاؤں والے اس کو ایک ادھار ہی سمجھ لیا کرتے کیونکہ ایک دوسرے کی چوری کرنا ان کے لئے کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی۔ان چوروں کی بازیابی کے لئے کھوجی بھی انہی میں سے ہوتے ہیں۔جو اتنے Expert ہوتے ہیں کہ کُھرا (پاؤں کے نشان) اگر پانی یا کسی پہاڑ کے اوپر سے بھی جاتا ہو تو اسکا پیچھا کرتے ادھر تک جا پہنچتے ہیں۔مگر بعض اوقات کھوجی دونوں اطراف سے ملا ہوتا ہے۔کھوجی کُھرا کو ڈھونڈتا ہوا جب چور کے گھر کے قریب پہنچ جاتا ہے تو کہتا ہے! دیکھو جی چور کا کُھرا بس ادھر تک ہی آتا ہے، لہٰذا چور یا تو زمین میں گُھس گیا ہے یا پھر آسمان پر چڑھ گیا ہے اصل میں اس کے آگے کھوجی نے چور سے سودا کیا ہوا ہوتا ہے۔یا پھر اس بہانے اپنا اور مُل ڈالنا مقصود ہوتا ہے۔

جب میں اسکول میں پڑھا کرتا تھا تو اس وقت نزدیکی گاؤں والوں کے بھی کئی لڑکے میرے ساتھ سکول میں پڑھا کرتے تھے۔چند کے نام مجھے ابھی بھی یاد ہیں۔دو ایک ہی نام کے شبیر ہوا کرتے تھے۔ہمارے ڈرائینگ کے ماسٹر جن کا نام ماسٹر ظہور احمد صاحب تھا بہت ہی مزاحیہ طبیعت کے مالک تھے۔جب بھی ان کو بلاتے تو کہتے 'شبیرین'۔یہ دونوں ہی دیہاتی ہونے کے ناتے اپنی پڑھائی میں

کافی کمزور تھے۔ویسے ایک نزدیکی گاؤں والا لڑکا ہوتا تھا جس کا نام مختار احمد تھا۔وہ حساب میں بہت تھا۔اور دوسرے مضامین میں بھی کافی ہوشیار تھا۔اسی طرح ایک طالبِ علم تھے جو کہ ہم سے ذرا بڑی کے تھے مگر ہمارے کلاس فیلو تھے۔ان کا نام احمد خان صاحب جویا تھا۔وہ بھی کلاس میں ماشاء اللہ کا ہوشیار تھے۔ان سب کے ساتھ ہمارے کافی دوستانہ تعلقات ہوا کرتے تھے۔دراصل دیہاتی لوگ ا کھیتی باڑی کی وجہ سے شہر والوں سے ذرا پیچھے رہا کرتے تھے۔مگر اُن میں پڑھے لکھے لوگ کافی سلجھے ہوئے تھے۔ربوہ آباد ہونے سے ان دیہاتیوں کو تعلیم حاصل کرنے کا کافی موقعہ ملا جس سے کم از کم ا کی اولادیں تعلیم کے زیور سے بہرہ ور ہو گئیں۔ہمارے ربوہ میں تعلیم حاصل کرنے سے ان لوگوں ۔ شہروں کا رُخ کیا اور جہالت سے باہر آئے۔ورنہ یہ لوگ صرف زمینداروں کے مُزارعے یا کمّی ہی بن کر اپنی اور اپنی اولادوں کی عمریں گنوا دیا کرتے تھے۔اسلئے ان نزدیکی گاؤں والوں کو ربوہ کا احسا مند ہونا چاہئے کہ ربوہ نے ہی ان کو تعلیم کا زیور عطا کیا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو احمدیت کے نور سے بھی منور فرمائے۔اور خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے مسیح موعودؑ کا دامن پکڑنے کی بھی توفیق دے۔تاکہ یہ لوگ جہالت سے باہر نکلیں اور ان کی آخرت بھی سنور جائے۔

جہاں تک چمن عباس والے چنگڑوں کا ذکر ہے وہ بھی ربوہ کے آباد ہونے کے بعد سے کا ترقی کر گئے ہیں۔کئی تو ماشاء اللہ احمدی بھی ہو گئے ہیں۔جن میں ایک کو تو میں خود ذاتی طور پر جا ہوں۔ان کا نام یوسف صاحب ہے۔اب وہ الحمدللہ پکے احمدی ہیں اور سنا ہے ان کا بہت بڑا کاروبا بھی ہے۔اسی طرح کئی ایسے لوگ ہیں جو کہ ماشاء اللہ ربوہ میں تعلیم حاصل کرنے سے دنیا میں کا ترقیات پا گئے ہیں۔ربوہ بننے سے ان نزدیکی گاؤں والوں کی زندگیاں بھی سنور گئی ہیں۔

اُن دنوں ربوہ میں ہر محلّہ میں رات کو باقاعدہ پہرہ لگا کرتا تھا۔دن میں ہمارا سارا وقت سکول کے کاموں، گھریلو کام کاج اور جماعتی وقارِ عمل میں گزرتا اور رات محلّہ کی چوکیداری میں۔یہ بھی خدا تعالیٰ

کا سراسر فضل ہی تھا کہ دن رات کاموں میں گزرتا مگر تھکاوٹ نام کو نہ ہوتی تھی۔اور مزے کی بات یہ ہے کہ نہ ہی اُس زمانہ میں کسی کو میں نے بیمار ہوتے دیکھا۔یہ صرف اور صرف خدا تعالیٰ کا خاص فضل تھا۔ساتھ حضرت مصلح موعودؓ کی درد بھری دعائیں تھیں۔بے سروسامانی، حفظانِ صحت کا بھی کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ڈاکٹرز بھی کوئی خاص نہ تھے بس گزارہ کے لائق۔ہم تھے کہ جنوں کی طرح دن رات کام کیا کرتے تھے۔

جہاں تک ہماری تربیت کا تعلق ہے ہمارے زمانہ میں خدا کے فضل سے صحابہ حضرت مسیح موعودؑ کے قریب بیٹھ کر اُن کی نصائح اور تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق ملا کرتی تھی اور اُن کی دعائیں لیا کرتے تھے۔اور سب سے بڑھ کر حضرت مصلح موعودؓ کی نصائح اور احکامات کو سُن کر، جو کہ آپؓ اپنے جمعہ کے خطبات یا جلسہ سالانہ کے مبارک ایام یا عام جلسوں یا اجتماعات پر دیا کرتے تھے پر عمل کرنے میں ہم ہمیشہ پیش پیش ہؤا کرتے تھے۔جو نیکی کا خمیر خدا کے اُس فرستادہ نے ہمارے دلوں میں بھر دیا ہے عام آدمی اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

ہم اس بات پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے کہ ہم خدامِ دین ہیں اس وقت کے جس وقت خدا کا ایک موعودؓ ہماری آبیاری دن رات کرتا تھا اور ہمیں ہر اس بری بات سے روکتا تھا جو کہ اخلاقی اور روحانی لحاظ سے نقصان دہ تھی۔اس نے ہمیں وہ فراست اور حکمت کے اصول لکھا پڑھا دیئے ہیں جن پر چل کر ہم آئندہ کی نسلوں کی اور جماعت کی ایسے رنگ میں خدمت کرنے کے ماشاء اللہ حامل ہو چکے ہیں کہ اس کا عُشرِ عشیر بھی غیر میں نہیں پایا جاتا۔پیار و محبت اور جماعت کی اطاعت کا مادہ جو ربوہ کے بسنے والوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے وہ دنیا کے کسی کونے میں پایا جانا محال ہے۔سوائے قادیان کے۔جو کہ مسیح موعودؑ کی پیاری بستی ہے۔جہاں سے نور کی شعاعیں دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئی ہیں۔جس کا بڑا حصہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ربوہ کے حصہ میں آیا ہے۔

اس زمانہ میں ربوہ میں خدا کے فضل سے نہ ہی کوئی گالی گلوچ ہوتی تھی اور نہ ہی سگریٹ

نوشی۔اور شاذ ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو کہ گالی گلوچ کرتا ہو۔یا سگریٹ نوشی کرتا ہو۔مگر اب کا میں کہہ نہیں سکتا کیونکہ اب غیر احمدی جو اس شہر میں آکر بسنے شروع ہو گئے ہیں اور ان لوگوں کے آنے سے ماحول کافی بدل گیا ہے۔ربوہ میں نماز پر بہت زور دیا جاتا تھا۔شاید ہی کوئی بدقسمت بے نمازی ہو ورنہ ہر طبقہ کا فرد نماز میں باقاعدہ تھا۔ربوہ ایک ایسی بستی تھی جہاں ہر وقت عرفان اور حکمت کی ہی باتیں ہؤا کرتی تھیں اور نیکی اور تقویٰ کا اونچا معیار تھا۔ہر ایک اسلام اور احمدیت کا مبلغ تھا۔السلام علیکم کہنا ہر چھوٹے بڑے کی یہاں تک عادت ہوتی تھی کہ ہر کوئی یہی چاہتا تھا کہ سلام کہنے میں وہ پہل کرے۔حضرت حافظ محمد رمضان صاحب مرحوم کا واقعہ تو ہر احمدی جانتا ہے کہ انہوں نے آتی ہوئی بھینس کو سلام کہہ دیا تھا مبادا کہ وہ کسی بھائی کو سلام کہنے سے محروم رہ جائیں۔حضرت مصلح موعودؓ نے ربوہ میں احمدیوں میں آپس میں پیار محبت بڑھانے کے لئے کلو جمیعاً کو بھی رائج فرمایا جس سے ہم عموماً نزدیکی ہمسائے دار اپنے اپنے گھروں سے اپنا اپنا پکا ہؤا کھانا لا کر اکٹھا کھایا کرتے تھے۔

وہی ربوہ جس کے بارہ میں ہمارے ہمسائے، چنیوٹ اور لالیاں اور سرگودھا کے علاوہ قریبی قصبوں والے ہم پر ہنسا کرتے تھے کہ یہ لوگ خود ہی اس شورزدہ زمین میں بھوکوں مر جائیں گے اور بیماریوں سے ختم ہو جائیں گے۔اب ماشاء اللہ یہی ربوہ والے ہی ساری دنیا کے نجات دہندہ بن چکے ہیں۔ہمارے مخالف مولویوں کے پیٹوں میں آگیں لگی ہوئی ہیں۔اور ہمارے مخالف حیلوں بہانوں سے ان بے گناہ ربوہ والوں کو مقدموں میں پھنسوا کر اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرتے ہیں۔ حقوق کو غصب کرنا اب ان مخالفین کا شیوہ بن چکا ہے۔ظلم کی انتہا یہ کہ ہمارے پیارے ربوہ کا نام بھی تبدیل کر کے چناب نگر رکھ دیا گیا ہے۔جس میں حکومت خود ملوث ہے۔

ربوہ کے قریبی قصبے والوں کو شاید یاد نہ ہو کہ جب دریا کے چڑھ جانے سے سیلاب ربوہ کے ارد گرد دیہات اور قصبوں کو اپنے لپیٹ میں لے لیا کرتا تھا تو اُس وقت ہمارے خدام ہی اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر وہاں ان کی مدد کو پہنچا کرتے تھے جہاں پر پانی کئی کئی فٹ اونچی موجیں مار رہا ہوتا تھا لوگ

اوران کے مویشی ڈوب رہے ہوتے تھے تو یہ خدام اپنی جانوں کی پرواہ کئے بغیر ان کو بچاتے تھے نیز ہرخطرہ کے وقت ربوہ والے ہی ان کی مدد کو آیا کرتے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوتی ہے جب یہی گاؤں والے مولویوں کے کہنے پر احمدیوں کے فوراً خلاف ہوکر مولویوں کی ٹیم میں شامل ہوجاتے ہیں سوائے چند ایک کے سب ان درندوں کے ساتھی بن کر ظلم پر کمر باندھ لیتے ہیں۔

ربوہ کے نشیب وفراز

ربوہ کی پہاڑیاں:

پہاڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ دریائے چناب کے ساتھ ساتھ چنیوٹ سے سرگودھا جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ بلکہ دریائے چناب کی دوسری جانب جہاں سے چنیوٹ کی سرحد شروع ہوتی ہے سے ہی ان پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس سلسہ کو کاٹ کر چنیوٹ کی سرحد سے ملحقہ ایک چھوٹا سا درّہ ہے۔ اس درّے سے گزرنے کے بعد ایک پُل شروع ہوتا ہے۔ جس کے اوپر سڑک تعمیر ہے۔ اس کے اندر سے ریلوے لائن گزرتی ہے۔ (اب نیا پُل تعمیر ہوگیا ہے) جب ربوہ کی سرحد شروع ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی پہاڑوں کا سلسہ شروع ہوجاتا ہے۔ جہاں سے الف محلّہ کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ ان پہاڑوں کے سلسلہ میں ایک بہت بڑا لمبا سا پتھر کا بت بنا ہوتا تھا۔ سنا ہے کہ وہ ابھی قائم ہے۔ بہرحال وہ پہاڑیوں کا سلسلہ پھر قبرستان کے درّے سے ہوتا ہوُا احمد نگر کی جانب جو سڑک ہے وہاں تک آتا ہے جہاں پر ایک ٹیوب ویل ہے۔

کوٹ امیر شاہ کی جانب پہاڑوں کے اس سلسلہ میں ایک لمبی چٹان پر، جہاں پر ایک عام انسان کی رسائی محال ہے، جنگی ساز وسامان جن میں اونٹ، گھوڑے، گدھے اور انسانوں کی تصاویر بنی ہوتی تھیں۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ ایسی اُونچی جگہ پر یہ سب کچھ کیسے بنایا گیا۔ یہ بھی معمہ تھا جس کے بارے ہم ہمیشہ سوچا کرتے تھے۔ دوسرا پہاڑیوں کا سلسلہ ربوہ کی حدود کے اندر کی طرف ہے۔ جو ریلوے لائن تک آتا ہے جس میں گول بازار کی خوبصورت پہاڑی بھی شامل ہے۔ اس کے ساتھ چند

اور پہاڑیاں بھی شامل ہیں۔ جو فضلِ عمر ہسپتال کی پچھلی جانب واقع ہیں۔ ان سب پہاڑیوں پر غور کیا جائے تو یہ ٹی (T) جیسی شکل بن جاتی تھی۔ مگر اب حکومت پاکستان نے ہمارے ربوہ کی پہاڑیوں کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ گول بازار کی پہاڑی بہت ہی عمدہ ہے جس کی چوٹی اوپر سے فلیٹ ہے۔ جہاں پر کچھ خرچ کر کے عمدہ سا ریسٹورانٹ یا بیٹھنے کی جگہ بنائی جاسکتی ہے۔ جس سے ربوہ کے عوام اس پہاڑی سے محظوظ ہوسکتے ہیں۔

ریلوے لائن کو کراس کریں تو ہمارے ٹی آئی کالج کے قریب جہاں پر کسی زمانہ میں بوٹ پالش کی چھوٹی موٹی فیکٹری ہوُا کرتی تھی کے ساتھ بھی ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ ایک پہاڑی اقصیٰ روڈ پر واقع ہے جہاں پر مسجد اقصیٰ بنائی گئی ہے۔ جہاں پر ہمارے معزز دوست چوہدری منصور احمد صاحب بی ٹی حال انگلینڈ کا گھر ہوُا کرتا تھا۔ آجکل اس پہاڑی پر پانی کی ایک ٹینکی بنائی گئی ہے۔ مگر اب تو یہ پہاڑی بھی خاصی گھستی ہی جارہی ہے۔ اسی پہاڑی کے دامن میں ایک مسجد بھی ہے جو ہمیشہ نمازیوں سے بھری ہی میں نے دیکھی۔

ایک پہاڑی ریلوے روڈ کی دائیں جانب، اگر آپ غلہ منڈی کی طرف سے کالج یا اسکول کی جانب چلیں تو وہاں پر بھی ایک پہاڑی ہوُا کرتی تھی۔ جہاں پر میرے عزیز دوست راجہ حمید صاحب حال انگلینڈ کا گھر ہوُا کرتا تھا۔ اس جگہ اور بھی کئی مکانات تعمیر ہوگئے تھے جن سے وہ پہاڑی قریباً غائب ہی ہوگئی ہے۔ ویسے جب ربوہ آباد نہیں تھا تو اس وقت یہ پہاڑیاں کافی نمایاں ہوُا کرتی تھیں مگر آبادی کے روز بروز بڑھنے سے یہ خوبصورت پہاڑیاں نقشہ سے غائب ہوتی چلی گئیں۔

ایک اور پہاڑی جو چمن عباس کی پچھلی جانب جھنگ روڑ پر تھی اب بھی قائم ودائم ہے۔ یہ پہاڑی ربوہ کی پہاڑی تو نہیں کہلائی جاسکتی مگر میں نے اس کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ اس پہاڑی پر بھی ہم دوست کئی دفعہ چڑھے اور اترے ہیں۔ یہ پہاڑی بھی ایک عجوبہ سے کم نہ تھی وہ اس لئے کہ اس پہاڑی پر ٹوٹے ہوئے پتھر اتنے تھے کہ ایسے لگتا تھا جیسے یہ ٹوٹے ہوئے پتھروں کی پہاڑی ہے۔ ہم دوست اس

پہاڑی کے بالکل اوپر چڑھ کر ایک بڑے سے پتھر پر پیر رکھ کر سیدھے نیچے آیا کرتے تھے۔ یہ پہاڑی ٹوٹے ہوئے پتھروں کی پہاڑی کہلاتی تھی۔ پہاڑی کی پچھلی جانب ایک بڑا سا گڑھا ہوتا تھا جس میں بے شمار بڑے اور چھوٹے پتھر بکھرے پڑے ہوتے تھے اور ان پتھروں میں چکی کے پاٹ بھی پڑے ہوتے۔ جن پر ہمیں حیرانی ہوتی کہ پتھر تو ہوئے یہ چکیوں کے پاٹ کہاں سے اتنے آ گئے ہیں۔ یہ نشانات اس بات کی بھی نشان دہی کرتے تھے کہ یہاں پر بھی جیسا کہ مشہور ہے کسی اسلامی فوج کا پڑاؤ پڑا ہوگا۔ ایسے ہی نشانات بہشتی مقبرہ کے قریبی عام قبرستان میں بھی پائے جاتے ہیں یعنی ان کے جرنیلوں کی خاص قسم سے بنائی ہوئی قبریں ہیں، اور ٹھڑے وغیرہ۔

اس ضمن میں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس پہاڑی کے قریب یعنی جھنگ روڈ پر اس زمانہ میں پرانے زمانہ کے کھنڈرات تھے جو کہ اس وقت بالکل نابود ہو چکے تھے اور صرف پرانے زمانہ کے ٹوٹے پھوٹے برتنوں کی ٹھیکریاں ہی رہ گئی تھیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مجھے وہاں سے ایک دفعہ بہت ہی پرانے سکے ملے تھے جن پر مسلمانوں کے کسی بادشاہ کی تصویر بھی دھندلی سی نظر آتی تھی۔ میرے ایک عزیز شیخ مودود احمد صاحب آف انگلینڈ نے بتایا کہ اس جگہ سے انہیں بھی بہت سے پرانے سکے ملے تھے۔ جنہیں میں نے لاپرواہی سے ضائع کر دیا۔ ویسے ٹوٹی پھوٹی بے شمار ایسی چیزیں ہمیں ملا کرتی تھیں جن کو ہم بے سمجھی سے پھینک دیا کرتے تھے مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ ان پرانے سکوں اور اشیاء سے کافی معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔ ان سب نشانات سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اس جگہ پر یقیناً کسی زمانہ میں ضرور کوئی شہر آباد ہوگا۔

ربوہ کے ٹیلے:

ربوہ میں پہاڑیوں کے علاوہ بے شمار ٹیلے بھی ہوا کرتے تھے۔ جو زیادہ تر دارالرحمت غربی ریلوے لائن کے قریب ہی ہوا کرتے تھے جہاں اس وقت سوئمنگ پول ہے۔ اُس کی دائیں جانب اور ریلوے روڈ کے قریب قریب ہمارے گھر کے بالکل سامنے بھی ریت کے بے شمار ٹیلے تھے۔ ان کے

علاوہ ریلوے لائن کے ساتھ جہاں پر اس وقت لیول کراسنگ بنا ہوا ہے۔ ان ٹیلوں میں بیشمار ابابیلوں نے اپنے گھونسلے بنائے ہوتے تھے۔ کچھ ٹیلے حکیم فضل الٰہی صاحب مرحوم کے گھر کی بائیں جانب بھی تھے۔

میری یادداشت کے مطابق سوائے ہمارے محلّہ کے ایسے ریت کے ٹیلے سارے ربوہ میں کہیں بھی نہیں ہوتے تھے۔ ان ٹیلوں کے علاوہ ریت بھی بے شمار ہوتی تھی جو کہ صرف ہمارے ہی محلّہ میں ہوا کرتی تھی۔ اس ریت پر کبھی کبھار بارش ہو جانے سے زمین میں سے سُرخ سُرخ رنگت کی بیر بوٹیاں نکل آیا کرتیں تھی۔ جب کبھی ہم ان بیر بوٹیوں کو پکڑتے تو وہ فوراً ہی مرجایا کرتیں۔ اس ریت کا فائدہ یہ تھا کہ جب کبھی بارش ہوتی تو ہمارے کھیل کود کے لئے بہت مزہ رہتا۔ اور اسی ریت کے ٹیلوں پر کبڈی اور میرو ڈبہ اور مختلف کھیلیں کھیلتے۔ کیا ہی اچھے دن تھے!!

ربوہ کے نمایاں گڑھے:

جہاں تک مجھے یاد ہے ربوہ میں چار نمایاں بڑے گڑھے تھے۔ ان کو ہم سب ربوہ والوں نے باہمی وقارِ عمل کے ذریعہ پُر کیا۔

سب سے بڑا گڑھا ہمارے پکے گھر کے قریب جہاں اس وقت سوئمنگ پول ہے، بلکہ عین اسی جگہ پر، بہت ہی بڑا گڑھا ہوتا تھا۔ اس میں اگر بڑا آدمی بھی گر جائے تو وہ بھی باہر نکل نہ سکتا تھا۔ خدا جانتا ہے کہ یہ گڑھے کیسے پیدا ہوئے۔

دوسرا بڑا گڑھا اقصیٰ روڈ پر مکرم و محترم عبدالکریم چیمہ صاحب مرحوم اور مکرم و محترم عبدالرحیم راما صاحب مرحوم مغفور کے گھروں کے قریب ہوا کرتا تھا۔ اس کو بھی وقارِ عمل کے ذریعہ پُر کیا گیا۔

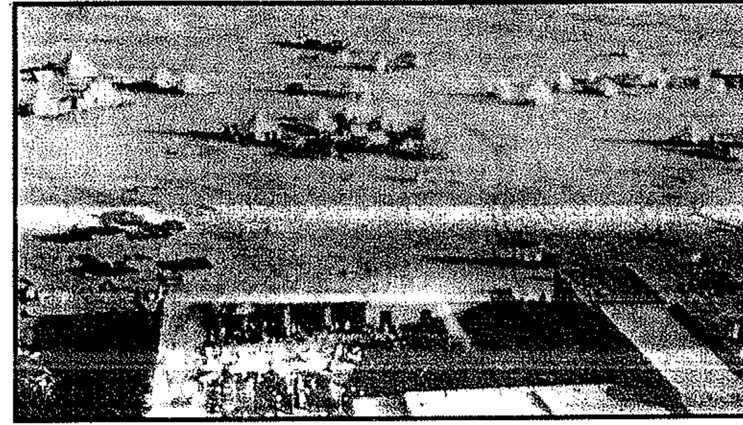
تیسرا بڑا گڑھا غلہ منڈی کے پاس میری مراد ریلوے لائن کے اِس پار جس میں عموماً پانی کھڑا رہا کرتا تھا۔

چوتھا گڑھا ریلوے لائن کی دوسری طرف میری مراد لڑکیوں کے سکول اور کالج کی

طرف۔اس گڑھے کے ساتھ ساتھ اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹوئے ہوا کرتے تھے۔اِس وقت میں ربوہ کی سطح کے بارے غور کرتا ہوں تو حیران ہو جاتا ہوں کہ ہم نے اس کھنڈر زمین کو کیسے آباد کر دیا۔ربوہ کا آباد ہونا یقیناً ایک معجزہ سے کم نہیں ہے۔ہم کیا چیز ہیں یہ صرف اور صرف اس ذاتِ باری کا ہی کرم اور رحم ہے۔ورنہ آج ان حالات کا سوچتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ ہم سب نے یہ کچھ کیسے کیا۔

ان بڑے گڑھوں کے علاوہ ربوہ میں اور بھی بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹوئے ہوا کرتے تھے۔ ان سب کو وقارِ عمل کے ذریعہ پُر کر دیا گیا۔یہ صرف اور صرف حضرت مصلح موعودؓ کی فراست، حکمت عملی اور اولعزم قیادت ہی تھی کہ ایسی بے حال اور بے ڈھنگی سی جگہ کو ایک خوبصورت بستی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس وقت یہ جماعت بیشک کمزور اور غریب تھی صرف اتفاق اور اطاعت ہی تھی جس نے اس بنجر زمین کو جنت بنا دیا۔الحمدللہ علیٰ ذالک۔

ربوہ میں پہلا جلسہ سالانہ اور جلسہ سالانہ کے مبارک ایام



''ربوہ میں پہلا جلسہ سالانہ ۱۹۴۹ء میں ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ اپریل کو ہوا۔ جس میں مردوزن کی تعداد سترہ ہزار تھی۔اس کے علاوہ اسی سال دسمبر میں بھی ایک اور جلسہ سالانہ منعقد ہوا۔گویا ایک کی بجائے دو جلسہ سالانہ منعقد ہوئے تھے۔(بحوالہ تاریخ احمدیت جلد ۱۳ صفحہ ۱۷۲ تا ۲۴۸ نیز صفحہ ۲۴۴ تعداد جلسہ سالانہ ربوہ) جلسہ کے شروع ہونے کے چند دن پہلے ربوہ کا عارضی ریلوے سٹیشن بنا ہوا تھا۔جس سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام

کے مہمانوں کے لئے کافی سہولت ہوگئی۔مہمانوں کی رہائش کے لئے ریلوے سٹیشن کے قریب بیرکوں میں انتظام کیا گیا۔سب سے پہلا لنگر خانہ موجودہ تار گھر اور فضل عمر ہسپتال کے پیچھے پہاڑ کے دامن میں تیار کیا گیا۔جہاں پر ۴۵ تنور لگائے گئے تھے۔'' (بحوالہ 'ربوہ')

ہمارے ایک عزیز دوست اور بزرگ عبدالرحیم صاحب ساقی ہیں۔جو کہ حال ہی میں لاہور سے انگلینڈ تشریف لائے ہیں۔ان کا بیان ہے کہ پارٹیشن کے بعد ربوہ میں ۱۹۴۹ کے پہلے جلسہ سالانہ میں وہ بھی حاضر ہوئے تھے۔وہ دریائے چناب سے بیڑیوں (کشتیوں) کے ذریعہ تخت ہزارہ سے ربوہ پہنچے تھے۔ان کا بیان ہے کہ ربوہ اس وقت ایک اُجاڑ تھا جگہ جگہ جڑی بوٹیاں اور ٹیلے تھے۔اس وقت تو دِن کو بھی وہاں سے خوف آتا تھا۔

ربوہ میں جب جلسہ سالانہ کے ایام قریب آتے تو ربوہ کو دلہن کی طرح سجایا جاتا۔جلسہ سالانہ پر آنے والے مہمانوں کے لئے کسیر گڈوں میں بھر بھر کر آتی۔جو لوگوں کے گھروں، لنگر خانہ جات، جلسہ گاہ میں اور مہمانوں کی رہائش گاہوں پر پہنچائی جاتی۔نیز مستورات کے لئے لجنہ اماءاللہ کے ہال کی باہر کی جانب چار دیواروں کے اندر بچھائی جاتی۔

جلسہ سالانہ سے چند دن پہلے سارے ربوہ میں کمیٹی کی گاڑیوں کے ذریعہ جو فیصل آباد وغیرہ سے منگوائی جاتیں سے باقاعدہ پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تاکہ ہزاروں مہمانوں کی آمد و رفت سے گرد نہ اٹھنے پائے۔اور ریلوے سٹیشن چونکہ اس وقت چھوٹا سا تھا اور لوگوں کی حفاظت کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ تھا لہٰذا ان دنوں ریلوے سٹیشن کی سامنے والی جگہ پر مہمانوں کی سہولت کے لئے تاروں کی باڑیں لگائی جاتیں اور بسوں کے اڈہ کو بھی اسی طرح محفوظ کیا جاتا۔نیز ربوہ کی خاص خاص عمارات کی ہر طرح سے مرمت کی جاتی اور خوبصورت بنایا جاتا۔نیز ربوہ کے مکین بھی اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے گھروں کو باقاعدہ درست کرتے اور کوچیاں پھرواتے یا خود کرتے۔گویا جلسہ سالانہ کے ایام آتے تو ہر فرد اپنے آپ کو خوشی خوشی کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا۔پھر ڈیوٹیوں کے چارٹ چھپ کر باقاعدہ محلہ جات کو

پہنچائے جاتے ۔لنگر خانوں کو پھر سے ٹھیک ٹھاک کیا جاتا اور وہاں پر ضروری سامان پہنچایا جاتا۔باقی مہمانوں کے کھانے پینے کے لئے باقاعدہ مٹی کے پیالے اور آبخورے بنائے جاتے جو کہ ریلوے سٹیشن کے قریب مٹی کے برتن بنانے والے میاں مہر دین صاحب بناتے۔ان مٹی کے بنائے ہوئے پیالوں اور آبخوروں کو ہر چھوٹا بڑا استعمال کرنے میں ایک خوشی اور راحت محسوس کرتا تھا۔ مجھے اپنا یاد ہے کہ میری ڈیوٹی عموماً اپنے دارالرحمت غربی کے لنگر خانہ میں روٹیاں تقسیم کرنے میں لگتی تھی۔کیا ہی مزہ تھا ان ڈیوٹیوں کے دینے میں یہی تو مزے تھے جن کی یادیں ابھی تک قائم ہیں۔نیز حضرت مصلح موعودؓ کا حکم تھا کہ ربوہ کا ہر مکین اپنے گھر میں مہمانوں کو ٹھہرائے۔ ہمارے گھر ہمیشہ اتنے مہمان آیا کرتے کہ ہمارا گھر بھر جایا کرتا تھا۔نہ ہم گھر کی تنگی سے پریشان ہوتے اور نہ ہی مہمان کبھی گلا کرتے۔کبھی بھی ان مہمانوں نے اچھی چیز کا مطالبہ نہ کیا۔سب مہمانوں اور میزبانوں کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ جلسہ سالانہ سے پوری طرح مستفیض ہونا ہے اور جلسہ کی ہر تقریر کو سننا ہے۔

جلسہ سالانہ کے شروع ہونے سے چند دن پہلے سپیشل گاڑیاں چلتی تھیں جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے معزز مہمانوں کو پاکستان کے طول وعرض سے اٹھا کر ربوہ لاتیں۔اسی طرح سپیشل بسیں اور ہر طرح کی سواریوں کا انتظام کیا جاتا۔اور بعض اپنی ذاتی کاروں پر تشریف لاتے۔گویا جس طرح بھی ہوتا مہمان پہنچا کرتے۔

جلسہ سالانہ کے تین دن پلک جھپکتے گزر جاتے۔ پھر جب مہمانوں کی واپسی کا خیال آتا تو ربوہ کا ہر فرد غمگین اور افسردہ ہو جاتا اور اسی دن سے اگلے سال کا انتظار شروع کر دیتا۔قربان جائیں حضرت مسیح موعودؑ کی اس پیاری جماعت اور جماعت احمدیہ کے خلفاء پر جنہوں نے اتنا پیارا اور ایک منظّم معاشرہ پیدا کیا۔اب تو ماشاءاللہ لنگر خانہ بھی عالمی ہو گیا ہے اور جلسہ بھی عالمی۔مگر ان سب نئے لنگروں اور جلسہ سالانوں کی ابتداء پہلے قادیان اور پھر ربوہ سے ہی ہوئی۔کیا امریکہ کیا یورپ اس جیسا نظام اور کام کرنے کا جذبہ تو پیدا کر کے دکھائے۔ایسی فراست اور انتظام مسیح موعود علیہ السلام کی اس

الٰہی جماعت کے علاوہ کہیں بھی نہیں مل سکتے۔

بیس سال سے زیادہ عرصہ سے پاکستان کی حکومت نے اپنی ہی بدبختی کی وجہ سے اس الٰہی جلسہ کو ربوہ ہی سے نہیں بلکہ سارے پاکستان میں حکماً بند کر دیا ہوا ہے۔ظلم کب تک چلے گا۔جب خدا تعالیٰ کے فضل سے ربوہ میں جلسہ سالانہ کرنے کی اجازت ملی تو دُنیا دیکھے گی کہ احمدیت کے پروانے کیسے اُڑتے ہوئے چلے آتے ہیں۔

ربوہ کے اسکولز اور کالج

جب ہماری رہائش ریلوے سٹیشن کے قریب کچے گھر میں ہوا کرتی تھی۔تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرا سب سے پہلا سکول ریلوے سٹیشن کے قریب جہاں اس وقت دارالضیافت ہے کے پاس کچی اینٹوں کی بیرکس میں ہوتا تھا۔اس وقت کے میرے کلاس فیلوز مجھے قطعاً یاد نہیں۔اور مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کس سن میں مجھے داخل کروایا گیا اور پھر کس سن میں میں نے اسے خیر باد کہا۔اس نرسری کے سکول میں مجھے یہاں تک یاد ہے وہاں پر زمین پر بیٹھنا پڑتا تھا اور گرد جگہ جگہ ہوتی تھی۔

اس کے بعد دارالرحمت وسطی کے پرائمری سکول میں داخل ہوا۔اُس پرائمری سکول میں ہمارے ہیڈ ماسٹر جناب فقیر محمد صاحب تھے آپ درمیانہ قد کم گو فرشتہ سیرت انسان تھے۔میرے استاد مکرم شیر علی صاحب تھے۔ان کی عادت تھی کہ آپ جب ہمیں حساب کے لئے پہاڑے سکھاتے تو دو گروپ بنا کر ہمیں آمنے سامنے بٹھا دیتے۔ہم بھی جناب زور لگا لگا کر ایک دونی، دونی دو دونی چار کے پہاڑے سیکھتے۔اُن کے پہاڑے سکھائے ہوئے ماشاءاللہ ابھی تک یاد ہیں۔خدا تعالیٰ نے ہمیں استاد بھی ایسے بزرگ دیئے جو سکھانے کے علاوہ دُعائیں بھی ہمارے لئے کیا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے دلوں میں اُن سب کے لئے بڑی قدر اور عزت ہے۔اُس وقت میرے کلاس فیلوز میں سے رفیع الدین بابر آف



کراچی پاکستان اور مودود قدسی ابن ابوالحسن قدسی صاحب مرحوم پوتے حضرت صاحبزادہ عبداللطیف شہیدؓ عبدالمنان صاحب مربی سلسلہ آف لندن، شیخ محمد یونس صاحب، احمد خان صاحب جویا، وہی شبیرین، بشیر احمد صاحب اعوان، موسیٰ شریف صاحب، سید ناصر احمد شاہ صاحب، ناصر احمد صاحب شمس وغیرہ تھے۔ یہ دوست ابھی تک اسی طرح عزیز اور پیارے ہیں جیسے مجھے بچپن میں تھے۔ اللہ تعالیٰ میرے تمام دوستوں کو سدا خوش وخرم رکھے۔ آمین

پرائمری اسکول پاس کرنے کے بعد میں پھر خدا تعالیٰ کے فضل سے ہائی اسکول میں گیا۔ جو کہ جامعۃ المبشرین کے بالمقابل ہے۔ وہاں پر اس وقت ہمارے ہیڈ ماسٹر جناب محمد ابراہیم صاحب جمونی مرحوم ومغفور تھے۔ آپ کو کرکٹ بہت پسند تھی۔ نیز کھیلوں کے بہت شیدائی تھے۔ اور اس وقت ہمارے اسکول کے نتائج بھی سارے ضلع میں ٹاپ کے ہوتے تھے۔ اور ڈسپلن بھی اعلیٰ قسم کا۔ نہ کوئی گالی گلوچ اور نہ ہی کوئی لڑائی جھگڑا۔ پڑھائی کے وقت پڑھائی اور کھیلوں کے وقت کھیل۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہمارے سب ہی استاد بہت ہی پیار کرنے اور محنت سے پڑھانے والے تھے۔ اس وقت ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب حساب کے استاد نائب ہیڈ ماسٹر تھے۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب بھامبڑی۔ ماسٹر عطاء اللہ صاحب مرحوم۔ ماسٹر مقصود احمد صاحب۔ ماسٹر بشارت احمد صاحب۔ ماسٹر سعد اللہ صاحب مرحوم۔ ماسٹر ابراہیم صاحب ڈرائینگ ماسٹر۔ ماسٹر محمد علی صاحب۔ ماسٹر اللہ بخش صاحب۔ ماسٹر محمد بخش صاحب مرحوم۔ ماسٹر ہارون خان صاحب۔ ماسٹر حامد اقبال صاحب اور پی ٹی کے ماسٹر جناب غلام مرتضیٰ صاحب ہوا کرتے تھے۔ کھیلوں کے انچارج مکرم لطیف غزنوی صاحب آف ربوہ تھے۔ اُس وقت اسکول کی عمارت زیادہ تر چند کمروں پر مشتمل تھی۔

اسکول میں پڑھائی کا زمانہ بھی پلک جھپکتے گزر گیا۔ چند پُرانی یادیں ابھی تک یاد ہیں باقی زیادہ تر تو بھول ہی گیا ہوں۔ اسکول شروع ہونے سے قبل اسکول کی عمارت کے داہنے ہاتھ ہماری اسمبلی ہوا کرتی تھی۔ اس اسمبلی کے بعد پھر تمام طلباء اپنی اپنی کلاسز میں جایا کرتے تھے۔ ماسٹر ہارون

خان صاحب اور حامد اقبال صاحب انگلش پڑھاتے تھے۔ حساب ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب پڑھاتے۔ کبھی کبھی محمد ابراہیم صاحب ہیڈ ماسٹر انگلش پڑھاتے۔ باقی ماسٹر عطاء اللہ صاحب مرحوم بھی پڑھایا کرتے تھے۔ اور ڈرائینگ کے ماسٹر ظہور احمد صاحب تھے۔ وہ بہت مزاحیہ طبیعت کے مالک تھے۔ جب کبھی کسی کو سزا دینی ہوتی تو پہلے لڑکوں سے پنسلیں اکٹھی کراتے پھر اس کو سزا دینے والے کی انگلیوں میں ڈال کر ہاتھ کی انگلیوں کو آہستہ آہستہ دباتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے میرا خیال ہے کوئی زیادہ درد تو نہیں ہو رہی۔ مگر اندر سے لڑکے کی مارے تکلیف کے چیخیں نکل رہی ہوتی تھی۔

جہاں تک سکول میں کھیلوں کا تعلق ہے اسکی بھی چند یادیں ابھی تک قائم ہیں۔ ٹی آئی ہائی سکول میں ماشاء اللہ بہت اچھے اچھے کھلاڑی تھے۔ کیا کرکٹ اور کیا ہاکی دونوں ٹیمیں خدا تعالیٰ کے فضل سے بہت اچھی ہوا کرتی تھیں۔ خاکسار خدا کے فضل سے کرکٹ بھی کھیلتا تھا اور ہاکی بھی۔ مگر ہاکی میری زیادہ فیورٹ تھی۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے خاکسار سکول میں ہاکی کا کیپٹن تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ ہماری ہاکی کی ٹیم میانوالی گئی تھی۔ وہاں پر جو حال ہمارے ساتھ ان ظالموں نے کیا ہمیں کبھی نہیں بھولتا۔ اوّل تو ہمارا کھیلنے کی گراؤنڈ تک پہنچنا ہی بہت دشوار کر دیا تھا۔ راستہ میں یہ وحشی لوگ ہمیں گالیاں دیتے تھے۔ پھر جب کھیل شروع ہوا تو رول کرنے کے لئے ہمیں جب باہر جانا ہوتا تو وہاں کے تماشائی دھکے مارتے اور گالیاں نکالتے۔ لیکن ہم نے بھی ان تکالیف کے باوجود بڑی عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اس وقت میرے ساتھ کھلاڑیوں میں عبدالغفار عابد صاحب حال گلاسگو سکاٹ لینڈ بھی تھے۔

کھیل ختم ہونے کے بعد جب ہم باہر دکانوں کو دیکھنے کے لئے نکلے تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ وہاں پر کس مقدار میں نسوار کھائی جاتی ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جبکہ دیکھا کہ قطاروں میں ہر دکان پر نسوار کی بوریاں بھری بک رہی تھیں۔ ہم نے ایک دکاندار سے پوچھا کہ اتنی مقدار میں نسوار بک بھی جاتی ہے کہ نہیں؟ کہنے لگا بھائی صاحب یہ تو ایک دن کی مار ہے۔ گال پچکے ہوئے اونچے لمبے قد کے بڑی بڑی مونچھوں والے وحشت ناک اور دیہاتی قسم کے لوگ ہم نے سارے میانوالی

میں دیکھے

سکول کا وقت تو کچھ زیادہ ہی جلدی سے گزر گیا۔ سکول تو عموماً کھیل کود کا ہی زمانہ ہوتا ہے۔ اِس عمر میں لااُبالی اور لاپرواہی بھی ہوتی ہے۔ باقی مار بھی اسی زمانہ میں پڑا کرتی تھی۔ صبح سکول دیر سے آنے پر اسمبلی میں پی ٹی ماسٹر صاحب سے سونٹیاں پڑا کرتی تھیں۔ پھر ماسٹر عطاء اللہ صاحب مرحوم کی مار بھی ابھی تک یاد ہے۔ مگر اُن تمام اساتذہ کی اُس وقت کی مار بھی اب ہمیں عزیز ہے کیونکہ اُن کی اُس مار میں بھی اخلاص اور درد تھا اور نصیحت تھی۔

جب خاکسار نے میٹرک کا امتحان 1965ء میں پاس کیا تو میرا پہلے ارادہ ہوُا کہ کراچی اپنے کزن سید کرامت نور صاحب کے پاس جا کر ایم بی اے کروں۔ مگر وہاں پر ذاتی مجبوریوں کیوجہ سے مجھے واپس ربوہ آکر تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ہی داخلہ لینا پڑا۔ ۱۹۶۵ء میں اس وقت حضرت مرزا ناصر احمد خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ پرنسپل تھے۔ داخلہ کے لئے میں کافی لیٹ ہو چکا تھا پھر بھی حضور رحمہ اللہ نے ازراہِ شفقت مجھے داخلہ دے دیا۔ پھر خاکسار نے خدا کے فضل سے بی اے تک ٹی آئی کالج میں پڑھائی کی۔

اُس زمانہ میں ہمارے نائب پرنسپل صوفی بشارت الرحمٰن صاحب ایم اے مرحوم تھے۔ اُس وقت کالج کے لیکچرارز اور پروفیسرز یہ صاحبان تھے، ڈاکٹر نصیر احمد خان صاحب مرحوم۔ چودھری محمد علی صاحب ایم اے۔ محمد دین صاحب ایم اے مرحوم۔ ناصر احمد خان صاحب پرویز پروازی ایم اے۔ عبد الرشید صاحب غنی ایم اے۔ چودھری حمید اللہ صاحب ایم اے۔ پروفیسر چوہدری محمد شریف صاحب خالد ایم اے ایڈوکیٹ۔ قریشی عبد الجلیل صاحب صادق ایم اے۔ محمد احمد صاحب انور ایم اے پروفیسر تھیالوجی اور کھیلوں کے بھی انچارج۔ صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب جو کہ ہمیں انگلش پڑھاتے تھے جن کا پڑھانے کا اپنا انداز تھا۔ آپ فرماتے کہ چونکہ یہ مضمون انگلش کا ہے اس لئے اس کو اسی کی زبان میں مجھے پڑھانا ہوگا۔ جب آپ لیکچر دیتے تو ڈیسک پر بیٹھ کر دیتے۔ آپ بہت ہی

خوبصورت نوجوان تھے۔ آپ کے اسٹائل سے ہم بہت امپریس (Impress) ہوتے تھے۔ ہمارے کالج میں اس وقت ناصر احمد صاحب پرویز پروازی اور چودھری محمد علی صاحب کی وجہ سے آئے دن کالج میں کوئی نہ کوئی فنکشن ہورہا ہوتا تھا۔ مشاعرہ میں چوٹی کے شاعر آتے۔ نیز ادبی مجالس آئے دن منعقد ہوتیں اور ان کی وجہ سے کالج میں ہر وقت گہما گہمی رہا کرتی تھی۔ پرویز پروازی صاحب اس وقت بڑے جوبن پر تھے اور انکے شعروشاعری وغیرہ میں بڑے چرچے تھے۔ پرویز پروازی صاحب کے علاوہ طلباء میں سے اردو ادب کے روحِ رواں میاں فرید احمد صاحب، سید جمیل لطیف صاحب آف کینیڈا نیز ایک اور شخصیت نعیم عثمان مرحوم آف لندن بھی تھے جو کہ کسی وقت ہمارے کالج کی یونین کے صدر بھی رہے۔

باسکٹ بال کے انچارج چودھری محمد علی صاحب تھے جو ہر وقت کھلاڑیوں کی دیکھ بھال اور ان کی خوراک کا خیال رکھا کرتے۔ اور جب باسکٹ بال کے ٹورنامنٹ کا وقت قریب آنے کو ہوتا تو آپ اور زیادہ مصروف ہو جایا کرتے۔ اسی طرح ہمارے ہاکی کے انچارج عبد الرشید صاحب غنی تھے۔ بہت ہی خوش اخلاق اور ہمدرد انسان تھے۔ ماشاء اللہ بہت پیار کرنے والے اور محنتی انسان تھے اور ہیں۔ چونکہ میرا تعلق بھی ہاکی سے تھا لہٰذا ہماری ان سے بہت گپ شپ چلتی تھی۔ اُن کے ساتھ ہم نے ہاکی کے بہت سے ٹور کئے تھے۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے خاکسار کو ٹی آئی کالج کی ہاکی کی کپتانی کا فریضہ بھی انہوں نے سونپا تھا۔ خدا تعالیٰ نے خاکسار کو کما حقہ ادا کرنے کی توفیق بھی بخشی۔ الحمدللہ (ہاکی کا پوری طرح تذکرہ ’’کھیلوں میں‘‘ کرونگا)

1965 میں جب حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی وفات ہوئی تو حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کو خدا تعالیٰ نے خلافت کا منصب عطا فرمایا۔ آپ کے بعد قاضی محمد اسلم صاحب مرحوم ایم اے پرنسپل بنے پھر یکے بعد دیگرے صوفی بشارت الرحمٰن صاحب مرحوم اور چودھری محمد علی صاحب کالج کے پرنسپل بنے۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے مجھے ان سب کے دوران پرنسپل کالج میں پڑھنے کا موقع نصیب ہوا۔

حضرت مرزا ناصر احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جب تک پرنسپل رہے کھیلوں کے علاوہ تعلیم میں بھی ہمارا کالج سارے ضلع میں نمایاں رہا۔ آپ کو خدا تعالیٰ نے کالج میں بے شمار مخلصین بھی عطا کئے تھے۔ جن کے دلوں میں جماعت کے لئے اور طلباء کے لئے درد پایا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے استادوں پر بیشمار فضل اور رحمتیں نازل فرماتا رہے اور ہر آن حامی و ناصر ہو اور اللہ ان سے راضی ہو۔ آمین

اس کالج کے بعض طلباء نے ساری پنجاب یونیورسٹی کو ٹاپ کیا اور گولڈ میڈل حاصل کئے۔ جن میں اس وقت کے امام مسجد لندن مولانا عطاء المجیب راشد صاحب بھی ہیں۔ آپ نے خدا تعالیٰ کے فضل سے ساری یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔

جہاں تک میری پڑھائی کا تعلق ہے میں اپنی بعض گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے پوری طرح دھیان نہیں دے سکتا تھا اُس میں سے سب سے بڑی مجبوری میری والدہ مرحومہ تھیں۔ جو کہ میرے سکول کے زمانہ سے ہی اکثر بیمار رہا کرتی تھیں۔ مجھے ان کی تیمارداری اور گھر میں کھانے پینے کے انتظامات خود کرنے ہوتے تھے۔ اس لئے پڑھائی کے معاملہ میں، سکول سے لیکر کالج کے زمانہ تک خدا تعالیٰ نے میری خود رہنمائی اور مدد فرمائی، وہ اس طرح کہ جب بھی سالانہ امتحانات قریب آتے تو جو مشکل مضمون میں محسوس کرتا اس کے بعض سوالات خواب میں مجھے نظر آجاتے۔ اور میں انہیں رٹ لیا کرتا۔ جس سے میں امتحان میں پاس ہو جاتا۔ اسی طرح میٹرک میں بھی ہوا، ایف اے اور بی اے میں بھی۔ یہ صرف اور صرف ماں کی خدمت ہی تھی جس کا صلہ خدا ساتھ ساتھ مجھ گناہ گار کو دے دیا کرتا تھا ورنہ میں تو کسی بھی امتحان میں پاس نہ ہوتا۔ یا پھر ایسے ہوتا کہ جب امتحان میں چند دن رہ جاتے تو میں پھر صبح گھر سے اپنی کتابیں اٹھا کر کھیتوں میں پڑھنے کے لئے چلا جاتا اور شام کو واپس آتا۔ گویا چند دنوں کی ہی محنت سے خدا تعالیٰ مجھے امتحان میں کامیاب کر دیا کرتا۔ بی اے کے امتحان میں انگلش کا پرچہ تھا اور میں بہت فکر مند تھا۔ اس وقت میرے خدا نے مجھے 100 میں سے 60 نمبر کا سوال خواب میں بتا دیا۔ جس سے

خاکسار اچھے نمبر لیکر پاس ہو گیا۔ الحمد للہ

کالج کی یادیں تو بے شمار ہیں مگر میں ان سب کو چھوڑتا ہوں تا کہ مضمون لمبا نہ ہوتا جائے۔

ربوہ میں پکّی اینٹوں کے مکانات تعمیر کرنے کا حکم

غالباً ۱۹۵۲ یا ۱۹۵۳ء میں انجمن کی طرف سے ربوہ کی تمام کچی آبادیوں کی بجائے پکی اینٹوں کی عمارتیں بنانے کا حکم صادر ہوا۔ سو اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ہمارے نانا جان مرحوم سید احمد نور کابلیؓ نے بھی غلّہ منڈی کی پچھلی جانب جہاں پر اس وقت سویمنگ پول بنایا گیا ہے، کے قریب زمین خریدی۔ اس وقت یہ پلاٹ ربوہ کے سینٹر سے بہت دور محسوس ہوتا تھا۔ مگر اِس وقت یہ ربوہ شہر کا سینٹر ہی کہلاتا ہے۔



ہمارے گھر کے ساتھ ہیڈ مسٹریس مسعودہ بشیر مرحومہ اہلیہ مرزا بشیر بیگ صاحب مرحوم، ہیڈ مسٹریس کے مکان کے کرایہ دار صوفی بشارت الرحمٰن صاحب مرحوم کی ہمشیرہ آپا مبشرہ صاحبہ جنکے ایک بیٹے کا نام ظہیر الدین بابر ہے حال سعودی عرب بھی کچھ عرصہ تک رہیں، چودھری محمد بوٹا صاحب مرحوم، ولائت حسین شاہ صاحب مرحوم، سید عبد الستار شاہ صاحب مرحوم، مبارک احمد صاحب دودھ دہی والے مرحوم، ایک بھٹی صاحب ہوتے تھے جو کہ گاؤں کے رہنے والے تھے جن کے بیٹے ثناء اللہ صاحب بھٹی اور عبد اللہ بھٹی تھے، بھائی غلام احمد صاحب حال جرمنی اور بھائی عبد اللہ صاحب برف بوتل والے کے گھر تھے۔ ہم سب ایک کنبہ کی طرح رہا کرتے تھے۔ بہت پیار محبت اور اخلاص کا ماحول تھا۔ وہ دن یاد آتے ہیں تو آنکھیں بھر آتی ہیں کاش کہ وہ ایام پھر آجائیں۔ اکٹھے کھیلتے کودتے اور کھاتے پیتے نیز جماعت کے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جبکہ ہمارے نئے گھروں کی طرف ابھی بجلی نہیں آئی تھی، رات پڑنے لگتی تو یک دم ہی اندھیرا چھا جاتا۔ جب کسی وجہ سے گھر سے ذرا دیر کے بعد گھر پہنچنا ہوتا تو اتنا اندھیرا لگتا کہ کوئی چیز نظر نہ آتی۔ ٹوئے ٹبے کچھ نظر نہ آتا تھا گرتے پڑتے گھر پہنچتا۔ اس کے علاوہ سانپ بچھو کا بھی ہر وقت خطرہ

رہتا تھا۔ پیروں میں چپل ہی ہوتی تھی جس سے اور ڈر لگا کرتا۔ میں نے تو ان سب مصیبتوں کا ایک ہی حل نکالا ہوا تھا کہ جب میں نے اندھیرے میں غلہ منڈی کی طرف سے آنا ہوتا تو بس غلہ منڈی یا جہاں روشنی ہوتی ادھر ہی سے دوڑ لگا دینی اور گھر کے دروازہ پر آکر دم لینا اور تیزی سے گھر داخل ہو جانا۔ کافی دیر بعد ہمارے گھروں کے قریب سے جب بجلی گزری تو واپڈا کی طرف سے روشنی کے کھمبے نصب ہوئے تو پھر کچھ سکھ کا سانس لیا۔

جب آہستہ آہستہ آبادیاں بڑھنی شروع ہوئیں تو پھر ہمارے گھروں کے دائیں طرف یعنی بھٹے کی جانب ضیاء الاسلام پریس تعمیر ہوا اور دفتر الفضل اخبا کا دفتر بھی یہاں آ گیا جو کہ چمن عباس کی سرحد پر واقع ہے۔ دیکھا دیکھی پھر بڑی تیزی کے ساتھ لوگوں نے اپنے مکانات تعمیر کرنے شروع کر دیئے۔ ہمارے حلقہ کی مسجد ناصر ہے جو کہ غلہ منڈی کی مسجد کہلاتی ہے جس کے بالکل ساتھ دارالرحمت غربی کا لنگر خانہ بھی تعمیر کیا گیا جو کہ جلسہ سالانہ کے ایام میں استعمال ہوتا تھا۔

ربوہ میں ہمارے مشاغل اور کھیلیں

ربوہ کے مشاغل:

جیسا کہ خاکسار اس مضمون میں پہلے بیان کر آیا ہے کہ ہمارے مشاغل عام دنیاوی لوگوں کی طرح نہیں تھے کہ آوارہ گردیاں کرنا اور بازاروں میں غنڈہ گردی کرتے پھرنا۔ بلکہ سکول کے وقت تعلیم حاصل کرنا اور فارغ وقت میں گھر والوں کے لئے سودہ سلف لانے میں مشغول رہنا یا پھر جماعت کی طرف سے کوئی بھی حکم آئے تو اس پر عمل کرنا۔ جو کہ جماعت کی روایات کے مطابق حسبِ معمول وقارِ عمل کرنا یا پھر جماعتی کام کاج میں وقت صرف کرنا۔ جماعت کے کاموں کے علاوہ میں نے ایک اور اپنے آپ پر یہ ذمہ داری ڈالی ہوئی تھی کہ قبرستان جا کر اپنے نانا جان مرحومؒ کی قبر کے علاوہ جو بھی قریبی قبر خراب ہو اس کو ٹھیک ٹھاک کرتا تھا کیونکہ عموماً بارش برسنے سے بعض قبریں دھنس جایا کرتی تھیں۔
اس کے علاوہ محلے میں پہرہ وغیرہ دینا۔ یا پھر رمضان المبارک کے مبارک ایام میں اور بچوں کے ساتھ

صبح صبح لوگوں کو سحری کے لئے اُٹھانا نیز خاکسار اپنے محلّہ میں کافی عرصہ تک منتظم اطفال الاحمدیہ کی ذمہ داریاں بھی ادا کرتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ربوہ میں کھیلیں:

جہاں تک ربوہ کی کھیلوں کا تعلق ہے۔ اس بارہ میں یہ عرض ہے کہ ہمارے زمانہ میں عموماً گُلی ڈنڈا اور رات کو آنکھ مچولی کے علاوہ بڑی کھیلیں ہاکی، کرکٹ، باسکٹ بال، والی بال، رِنگ، کبڈی اور میرو ڈبہ وغیرہ کھیلا جاتا تھا۔ ویسے ہوتا یہ تھا کہ موسم کے حساب سے کھیلیں کھیلی جایا کرتی تھیں۔ اور خدا کے فضل سے اس وقت کے لڑکوں میں ہر کھیل کا ٹیلنٹ (Talent) بہت پایا جاتا تھا۔ ہمارے ربوہ نے خدا تعالیٰ کے فضل سے بڑے اچھے اچھے کھلاڑی پیدا کئے تھے۔ ایتھلیٹ بھی پائے کے ہوتے تھے۔ مجھے میرے کزن بھائی سید بشارت نور صاحب بتاتے ہیں کہ اُن کے ہم جھولی لطف الرحمٰن صاحب (لُپّا) ابن خان ارجمند خان صاحب مرحوم جو کہ اس وقت ماشاء اللہ کینیڈا میں رہائش رکھتے ہیں۔ سارے پاکستان میں ایک نمبر کے پول والٹ کے کھلاڑی تھے۔ ہاکی اور باسکٹ بال کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ ہاکی کے میدان میں ہمارے زمانہ میں ربوہ کی ہاکی کی ٹیم کے پائے کی سارے ضلع میں کیا سارے پنجاب بھر میں ٹیم نہیں پائی جاتی تھی۔ اگر ہم سے احمدیت کی وجہ سے زیادتی نہ ہوتی تو ہمارے ربوہ کے کھلاڑی ضرور نیشنل ٹیم میں بھی شامل ہوتے۔ جہاں تک ہاکی کا تعلق ہے جو کہ میری اپنی گیم تھی اس بارے میں بعد میں ہاکی کے حصہ میں کچھ ذرا تفصیل سے بیان کرونگا۔ باسکٹ بال میں تو ہمارے ربوہ کے کھلاڑیوں نے حد ہی کر دی تھی۔ پاکستان کی نیشنل ٹیم میں ہمارے ربوہ کے بے شمار کھلاڑی بڑی شان سے کھیلتے رہے ہیں۔ جن میں مرزا عبدالباسط آف ہنسلو انگلینڈ کے علاوہ شاہد سعدی۔ نصیر بندا، پرویز پیزہ، میجر چودھری سعید احمد اور قریشی سراج الحق صاحب جیسے کھلاڑی تھے۔ قریشی سراج الحق صاحب تو ماشاء اللہ کافی عرصہ باسکٹ بال کے انٹرنیشنل ریفری بھی رہے ہیں۔ مرزا عبدالباسط نے تو مجھے بتایا ہے کہ ان کی ٹیم کو تو باسکٹ بال میں پاکستان بھر میں گولڈ میڈل بھی ملا ہوا ہے۔

جہاں تک کرکٹ کا تعلق ہے۔ اس میں بھی ہمارے چوٹی کے کھلاڑی ہوا کرتے تھے۔ ہماری ٹیم خدا تعالیٰ کے فضل سے سارے ضلع بھر میں ہمیشہ اوّل پوزیشن لیا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجھے بھی اچھی کرکٹ کھیلنے کی توفیق ملی تھی۔ الحمدللہ

ہاکی:

ہاکی کا کھیل خدا تعالیٰ کے فضل سے قادیان کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ اس کھیل میں احمدیت نے بہت اعلیٰ کھلاڑی پیدا کئے۔ جو کہ بہت ہی عمدہ ہاکی کھیلتے تھے۔ مرزا انور احمد صاحب، مرزا حنیف احمد صاحب، لطیف احمد ننھا صاحب، حامد احمد صاحب بی ٹی، منور احمد صاحب بی ٹی، محمد لطیف غزنوی صاحب، حمید اللہ خان مرحوم، لطیف احمد صاحب حال ہنسلو انگلینڈ اور مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم کے بارے سنا ہے کہ وہ ہاکی کے بہترین گول کیپر تھے۔ نیز خواجہ منیر الدین صاحب قمر حال انگلینڈ اور مرزا عبدالحکیم صاحب مرحوم حال انگلینڈ وغیرہ۔ یہ تو وہ لوگ تھے جن کے بارہ میں نے سنا ہی ہے مگر کھیلتے کم ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

خاکسار کو خدا کے فضل سے اپنے محلے کے علاوہ سکول اور کالج کے زمانہ میں بہت زیادہ ہاکی کھیلنے کا اتفاق ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ناچیز کو خوب خوب ہاکی کھیلنے کا موقع عطا فرمایا۔

مجھے یاد ہے محلّہ دارالرحمت غربی اور نزدیکی محلّہ جات میں اس وقت بے شمار کھلاڑی ہوا کرتے تھے جو عموماً ہمارے ساتھ ملکر کھیلا کرتے تھے۔ مگر ہمارے محلے کے لڑکوں میں جو ہر وقت کھیلنے کے لئے تیار رہتے تھے اُن میں بشیر احمد اعوان حال فرانس، سخی محمد، سلیم احمد، تعظیم احمد، منور احمد لاہوری حال امریکہ، مقصود احمد سودا حال انگلستان، محمود احمد مودی حال جرمنی، قریشی عبدالرشید (کاکا)، محمد صادق صفدر، مبشر احمد (ککو) اور کبھی کبھار نصیر احمد سندھی حال امریکہ تھے اور مودود احمد قدسی حال امریکہ۔ باقی جاوید احمد صاحب گوگا (بی ٹی) اُن کے بھائی پرویز احمد صاحب (بی ٹی) نیز پروفیسر قریشی عبدالجلیل صاحب صادق بھی ہم میں کھیلنے کے لئے تیار ہو جایا کرتے تھے۔ (آپ ہر فن مولا تھے اور

ہیں۔) یہ وہ لڑکے تھے جو تقریباً ہر کھیل کھیلنے میں شائق رہتے تھے۔ اور خدا کے فضل سے ان سب میں ہر کھیل کا ٹیلنٹ بھی خوب پایا جاتا تھا۔ اس لئے تقریباً ہر کھیل میں ان سب کا نام ضرور آئیگا۔ با ایک بہت ہی پیارا دوست جمیل احمد تھا۔ جو نہ جانے دنیا کے کس کونے کُھترے میں گُم ہو کر رہ گیا ہے، بھی ہر فن مولیٰ تھا۔

ویسے اُس زمانہ میں ہمارے ساتھ کھیلنے والے ربوہ کے اور محلوں کے بھی بڑے بڑے اچھے اچھے کھلاڑی تھے۔ جن میں صدر محلّہ کی طرف سے کھیلنے والے مولانا منیر الدین صاحب شمس، نصیر اح صاحب ظفر حال انگلستان، شہاب الدین صاحب شابی حال سویڈن، وسیم احمد چھبی، خواجہ عبدالسلا صاحب مرحوم، خواجہ نعیم احمد صاحب مرحوم، بشیر الدین صاحب قمر حال انگلستان، صفی الدی صاحب قمر (مِسّا) وغیرہ تھے۔ مگر اس ضمن میں یہ بھی میں بتلاتا چلوں کہ شہاب الدین کی شاٹ کا ذکر کروں تو بے جا نہ ہوگا وہ یہ کہ شابی کی ہٹ جبکہ وہ جھک کر لگاتا تھا تو پیڈوں کے باوجود درد اندر تک جاتی تھی۔ اور چھبی کی کیری (Carry) سے کم از کم میں ضرور محظوظ ہوتا تھا۔ تھا وہ چھوٹا سا مگر کھلاڑی ب کا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اچھے اچھے کھلاڑی ہوا کرتے تھے۔ مگر خاکسار کو اس وقت یہی دوست یاد ہیں۔ میری دلی دُعا ہے اللہ ان سب پر اپنے بے شمار فضل اور رحمتیں نازل فرماتا رہے۔ یہ لوگ ہمیش میرے دل میں رہتے ہیں۔ خدا جہاں بھی انہیں رکھے خوش وخرم رکھے۔ آمین

عموماً صدر انجمن کی گراؤنڈ میں غلہ منڈی اور صدر محلّہ کے مابین میچز سخت اور دلچسپ ہوا کرتے تھے

سکول کے زمانہ میں ہمارے ہاکی کے انچارج لطیف غزنوی صاحب تھے۔ یہ وہ وقت ت جب کہ مجھے ہاکی کھیلنے کا ابھی شوق پیدا ہی ہوا تھا۔ اس وقت یہ کھیل باہمی محلّہ جات تک ہی محدود تھا ربوہ میں کھیلوں کے لئے چونکہ ایک ہی مناسب گراؤنڈ تھی جو کہ صدر انجمن کی گراؤنڈ تھی اس لئے بڑے میچز اسی گراؤنڈ میں ہوا کرتے تھے۔

ہمیں زیادہ تر چنیوٹ اور جھنگ میں میچز کھیلنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور چنیوٹ اور جھنگ ک

ٹیمیں اتنی زیادہ مضبوط نہیں ہوتی تھیں۔ چونکہ خدا کے فضل سے ہمارے ربوہ میں کھیلوں کا معیار ان شہروں سے خاصہ بلند تھا اس لئے ہم خدا کے فضل سے ان کو تو ان کے گھر میں ہی جا کر مار آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہم سرگودھا پولیس کے خلاف میچ کھیلنے گئے وہاں پر میچ میں ان کو شائد یہی ہدایت کی گئی تھی کہ بس لکڑیں ہی ''پاڑنی'' ہیں صحیح نہیں کھیلنا۔



میں جب بھی بال لیکر آگے جاتا تو ادھر سے دھڑا دھڑ مجھے میری ٹانگوں پر ہاکیاں پڑنی شروع ہو جاتیں۔ بال سے کم کھیلتے تھے کھلاڑیوں کو ہی زخمی کرنا ان کا صرف کام لگتا تھا۔

کالج میں ہماری ہاکی ٹیم کے انچارج عبدالرشید غنی صاحب تھے۔ آپ بہت ہی پیاری شخصیت تھے اور ہیں۔ جب تک مجھے کالج میں ہاکی کھیلنے کا اتفاق ہوا آپ ہی ہمارے انچارج رہے۔ آپ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ ایک کھلاڑی کی حیثیت سے ہماری تربیت کرتے تھے۔ ہم نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ آپ ہمارے بوس (Boss) ہیں۔ جب کھیل شروع ہوتی تو آپ بھی گراؤنڈ میں نیکر پہن کر بڑی پھرتی سے دوڑتے بھاگتے نظر آتے تھے۔ اور لڑکوں سے ہمیشہ ہنس کر بات کرتے اور جب کھیل ختم ہوتی تو آپ اپنے گھر لے جا کر چائے وغیرہ سے تواضع کرتے اور ہنسی مذاق سے میچز کی پلاننگ کرتے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ کو احمدی بچوں کی صرف دینی ہی نہیں بلکہ ان سب کی جسمانی صحت کا بھی ہر وقت خیال رہتا تھا۔ غالباً ۱۹۷۱ء میں آپ کی خواہش پر آل ربوہ ہاکی ٹورنامنٹ کروایا گیا۔ جس میں تین ٹیمیں بنائی گئیں۔ ایک کالج کی اور دو ریلوے لائن کے آر اور پار کی۔ ایک ٹیم جس میں ہمارے محلہ دارالرحمت غربی، وسطی، فیکٹری ایریا وغیرہ اور دوسری جانب ریلوے لائن کے دوسری جانب جس میں صدر محلہ جات اور گول بازار وغیرہ۔ شامل تھے خاکسار کو محلہ دارالرحمت

غربی کے ساتھ ملحقہ محلہ جات کی ٹیم کا کیپٹن بنایا گیا تھا

اِس ٹورنامنٹ میں میچز بہت دلچسپ تھے۔ آخر میں ہمارے حلقہ دارالرحمت اور کالج کی ٹیمیں فائنل میں آئیں۔ فائنل کھیل میں ریفری کے فرائض خواجہ نعیم احمد صاحب مرحوم اور لطف الرحمٰن صاحب کمپوڈر نے ادا کئے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس فائنل میچ کو دیکھنے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ بنفسِ نفیس تشریف لائے اور میچ کی رونق کو دوبالا کیا۔

میچ میں مقابلہ بہت سخت اور دلچسپ تھا۔ مگر اس میچ میں ایک مرحلہ ایسا آیا جبکہ ایک ایسا گول ریفری کی بے توجہی سے ہمارے خلاف دیدیا گیا جس پر ہماری ٹیم کے بعض جوشیلی قسم کے کھلاڑی احتجاجاً میدان سے باہر نکلنے شروع ہو گئے۔ جس پر میں نے اپنے کھلاڑیوں کو سمجھایا کہ تم لوگ جانتے ہی ہو کہ حضور انور باہر بیٹھے ہمارا میچ دیکھ رہے ہیں ہوش میں آؤ کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہی ہے واپس آؤ اور کھیل شروع کرو۔ بہر حال کھیل دوبارہ شروع ہو گیا۔ مگر رزلٹ وہی ہوا کہ ہم ایک گول سے ہار گئے۔

کھیل ختم ہونے کے بعد جب حضور انور رحمہ اللہ انعامات تقسیم کرتے ہوئے ہماری ٹیم کو انعامات دینے لگے تو فرمانے لگے کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کی ٹیم سے زیادتی ہوئی ہے۔ میں اِس بات پر بہت خوش ہوں کہ آپ سب نے سپورٹس مین شپ کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ ساتھ اس کارکردگی پر مجھے ۵۰ روپیہ کا انعام بھی دیا۔

آل ربوہ ٹورنامنٹ کے چند دن کے بعد مجھے میجر...... ملے اور کہنے لگے کہ حسن تم تیار ہو جاؤ کہ ہماری ربوہ کی ٹیم جھنگ ضلعی ٹورنامنٹ کھیلنے جا رہی ہے اور تمہیں حضور انور نے ازراہِ شفقت ربوہ کی ٹیم کا کیپٹن مقرر کیا ہے۔ مگر افسوس کہ اسی سال میرے انگلینڈ آنے کا پروگرام بن چکا تھا۔ تو پھر میں نے میجر صاحب سے معذرت کی کہ مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں اس ٹورنامنٹ میں شمولیت نہیں کرسکتا کیونکہ خاکسار کا انگلستان جانے کا پروگرام بن چکا ہے۔

اس طرح پھر ربوہ میں ہاکی کی حسین یادیں ایک بہت ہی اچھے انجام سے اختتام پذیر ہوئیں۔ میں تو ہمیشہ یہ ہی سوچتا ہوں کہ اس پچاس روپے کی ہی برکت سے خاکسار کے لئے انگلستان آنے کے راستے نکلے۔ نہ جانے خدا کے اس پیارے نے کس دُعا کے ساتھ اس ناچیز کو ۵۰ روپے عنائت فرمائے تھے کہ اس احقر کی زندگی ہی سنور گئی۔ اللہ اللہ کیا ہی پیارا وجود تھا وہ۔ اللہ تعالیٰ حضور رحمہ اللہ تعالیٰ پر اپنے بے شمار فضل اور رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔



تعلیمی میدان میں بھی آپ نے میری مدد فرمائی اور دنیاوی میدان میں بھی آپ ہی کی مدد سے میرے لئے ترقیات کے راستے نکلے۔

۱۹۷۲ء میں خاکسار انگلستان آ گیا۔ یہاں پر بھی پہلے پہل خاکسار کو ہاکی کھیلنے کا تھوڑا بہت موقع مل گیا۔ وہ ایسے کہ مکرم محمد ناظم غوری صاحب نے بڑی ہی محبت سے مجھے اپنے ساتھ اپنی ٹیم میں انٹروڈیوس کروا دیا۔ اس کے بعد ہمیں خدا تعالیٰ کے فضل سے ایک ہی ٹیم میں اکٹھے کئی میچز کھیلنے کی توفیق ملی۔ انگلستان میں انصار اللہ کے اجتماع میں ہمارا ہاکی کا میچ انصار اللہ بمقابل خدام الاحمدیہ اسلام آباد انگلستان میں ہوا جس کو حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بھی دیکھ رہے تھے۔ اس میچ میں خاکسار نے ایک گول دوسری ٹیم کے خلاف کر دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پاس موجودہ امیر صاحب جناب رفیق حیات صاحب نے دیا تھا۔ جب حضور انور نے پوچھا کہ یہ گول کس نے کیا ہے تو خاکسار نے عرض کی کہ حضور! یہ خاکسار نے کیا ہے تو پھر حضور انور مسکرا دیئے اور مجھے شاباش بھی دی۔

کرکٹ:

کرکٹ کی کھیل بھی ربوہ میں اُس وقت بڑے عروج پر تھی۔ جب بھی کرکٹ کا موسم آتا ہر محلّہ میں کرکٹ کے شوقین کرکٹ بیٹ اور گیند بغل میں دبائے گراؤنڈ میں آجایا کرتے۔ ہمارے محلّہ کے علاوہ صدر محلّہ جو کہ سڑک کے اُس طرف ہے جہاں پر سڑک کے قریب ٹیوب ویل ہے۔ وہاں سے سید

جمیل لطیف صاحب حال کینیڈا، اُن کا چھوٹا بھائی سید عبدالحئی خان حال امریکہ، سعید احمد اور اُن کے بڑے بھائی جو کہ پاکستان پولیس میں تھانیدار تھے۔ ان سب کے علاوہ اور بھی بہت سے کھلاڑی شامل ہوا کرتے تھے۔ اُن کی ٹیم کے ساتھ بھی کافی سخت میچز ہوا کرتے تھے۔ ہماری ٹیم میں عموماً حمید اللہ خان پٹھان مرحوم، ابراہیم احمد صاحب (ابرا)، ہارون احمد صاحب، سعید احمد صاحب، مبارک احمد صاحب، سخی احمد صاحب، عبدالرفیق صاحب صالح (پھیکا کاردار)، تعظیم احمد صاحب اور سلیم احمد صاحب وغیرہ ہوتے تھے۔

باقی قصرِ خلافت کے قریب میاں اظہر احمد صاحب (میاں اجی)، محمود احمد خان صاحب (میاں اودی)، میاں انور احمد صاحب (میاں انّو) اچھے کرکٹ کھیلنے والے کھلاڑی تھے۔ میاں صاحبان نے تو اپنے گھروں کے قریب ایک پکی کرکٹ کی پچ بھی بنائی ہوئی تھی۔ میں بھی کبھی کبھار اُن کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ باقی سکول اور کالج میں کافی کرکٹ کھیلی مگر میرا زیادہ تر رجحان اپنی ہاکی کی طرف ہی رہتا تھا۔

کرکٹ تو قریباً ہر محلّہ گلی میں کھیلا جاتا تھا اور چھوٹے بچّے بھی بڑے شوق سے کھیلا کرتے تھے۔ اگر کرکٹ کا بلاّ میسّر نہ ہوتا تو لکڑی لیکر ہی اُسے بلّے کے طور پر استعمال کرلیا کرتے تھے۔ اور کرکٹ کے گیند کی بجائے ربڑ کے گیند پر ہی گزارہ کیا جاتا۔ ربوہ کی چلچلاتی اور جھلسا دینے والی گرمی کی پرواہ کئے بغیر بچّے اور نوجوان میدان میں کھیلا کرتے تھے۔ اور جو میدان میں نہیں کھیل سکتے تھے انہوں نے اپنے گھروں کو ہی کرکٹ کا میدان بنایا ہوا تھا۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول کی کرکٹ کی ٹیم بہت اچھی ہوا کرتی تھی۔ انکے اکثر میچز باہر کے شہروں کی ٹیموں ساتھ ہوا کرتے تھے۔ مسجد فضل کے سابق نائب امام و سابق امیر کینیڈا اور موجودہ ایڈیشنل وکیل التصنیف لندن مکرم و محترم منیر الدین صاحب شمس بھی ہائی اسکول کی کرکٹ کی فرسٹ الیون میں ہوتے تھے اور اٹیک فاسٹ بالر ہونے کے علاوہ اچھے بیٹسمین بھی تھے۔ سکول کے آنر بورڈ پر ان کا نام بھی لکھا گیا تھا کہ یہ اپنے وقت کے سب سے اچھے بالر

اور بیٹسمین تھے۔ ضلعی ٹورنامنٹ میں ہمارے سکول کی ٹیم جھنگ جایا کرتی تھی جہاں احمدیت کی وجہ سے ہماری بہت مخالفت بھی ہوتی تھی۔ کرکٹ کا میچ ہو رہا ہوتا تھا تو باہر سے گندے انڈے مارے جاتے تھے اور گالیاں بھی دی جاتی تھی۔ لیکن الحمدللہ ہماری ٹیم بہت اچھا کھیل پیش کرتی تھی۔ منیر الدین صاحب شمس نے تو ریکارڈ قائم کیا تھا کہ ۱۹۶۵ء کے کرکٹ کے ضلعی ٹورنامنٹ کے فائنل میچ میں ۱۰۳ رنز بنائے تھے اور ناٹ آؤٹ رہے۔ اس پر انہیں وہ بلّا بھی انعام میں دیا گیا جس سے انہوں نے سینچری بنائی تھی اور نقد انعام بھی سکول کی طرف سے ملا۔ ٹورنامنٹ کمیٹی کی طرف سے انہیں سند امتیاز بھی دی گئی۔ سکول میں کرکٹ کی حوصلہ افزائی میں میاں محمد ابراہیم صاحب جمونی ہیڈ ماسٹر کا بہت دخل تھا۔ ٹیم کو با قاعدہ روزانہ کھیل کے بعد دودھ بھی پلانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ٹیم کے نگرانوں میں حامد اقبال صاحب حال یو کے اور میاں محمد امین صاحب بھی شامل تھے جو کھلاڑیوں کو بڑی سخت ٹریننگ دیتے تھے۔

چنیوٹ، لائیلپور (موجوہ فیصل آباد) اور سرگودھا وغیرہ جا کر بھی ہمارے سکول کی ٹیم میچز کھیلا کرتی تھی۔ بالخصوص چنیوٹ کے ساتھ میچ بھی بہت دلچسپ اور سخت ہوا کرتے تھے چنیوٹ میں تو ہمیں پتھراؤ اور گالیوں کا بھی اکثر سامنا ہوتا تھا لیکن کھیل میں خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اکثر جیت ہماری ہی ہوا کرتی تھی۔ ضلعی ٹورنامنٹ کا اصول تھا کہ فائنل جیتنے والی ٹیم کو بڑی ٹرافی ایک سال کے لئے دی جاتی تھی لیکن اگر وہی ٹیم متواتر تین سال ٹورنامنٹ جیت جائے تو وہ ٹرافی مستقلاً اُس سکول کی ٹیم کو دے دی جاتی تھی۔ جب ہماری سکول کی ٹیم نے متواتر تین سال ٹورنامنٹ جیت لیا تو یہ قانون بدل دیا گیا اور اسطرح ٹرافی مستقل طور پر نہیں دی گئی۔

سکول اور کالج کی کرکٹ کی بہت اچھی ٹیمیں تھیں لیکن مختلف محلہ جات کی بھی اچھی اچھی ٹیمیں تھیں۔ جن میں غلّہ منڈی کے علاوہ دارالصدر شرقی، دارالصدر جنوبی، دارالرحمت وغیرہ محلّہ جات کی ٹیموں کے آپسمیں خوب مقابلے ہوا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہماری ٹیم نے کئی میچ دارالصدر شرقی کی ٹیم کے ساتھ پہاڑی کے دامن میں بھی کھیلے۔ دارالصدر کی ٹیم میں مکرم منیر الدین صاحب شمس

کے علاوہ انکے بھائی بشیر الدین شمس صاحب حال امریکہ، محمد عاقل خان صاحب حال جرمنی، انیس احمد صاحب (نیجھی)، چوہدری نعیم احمد صاحب حال جرمنی، منصور احمد خان صاحب عرف گلّو حال امریکہ اور ان کے بھائی مبشر احمد صاحب، نسیم احمد صاحب چیمہ، ارشد احمد صاحب فاروقی (اچھی) اور مرزا عبدالرشید احمد صاحب حال یو کے نائب صدر انصار اللہ وغیرہ کا اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتا تھا۔

والی بال:

والی بال کا کھیل میرے ذاتی خیال کے مطابق سوائے ہمارے محلّہ دارالرحمت غربی کے علاوہ کم ہی کسی اور محلّہ میں کھیلا جاتا تھا۔

والی بال کی کھیل کے روحِ رواں ہمارے محلّہ کی ایک بہت ہی پیاری شخصیت پروفیسر عبدالجلیل صاحب صادق تھے اور ہیں۔ اُس زمانہ میں یہ کھیل ریلوے سٹیشن کے قریب چھوٹے سے میدان میں کھیلا جاتا تھا۔ اُس وقت والی بال کے کھلاڑیوں میں قریشی عبدالجلیل صاحب کے علاوہ چودھری محفوظ الرحمٰن صاحب، احمد حسین صاحب کاتب مرحوم، عبدالرفیق صاحب آصف مرحوم، بشیر احمد صاحب اعوان، ارشد احمد صاحب (بھایا) حال جرمنی، سہیل احمد صاحب حال کینیڈا وغیرہ ہوتے تھے۔ باقی ہمارے محلّہ کے علاوہ اور محلوں سے بھی دوست آ کر اس کھیل میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔ کھیل کے اختتام پر محمد خان حال ربوہ کے چھوٹے سے ہوٹل میں لسّی پینے پلانے کا دور چلا کرتا تھا۔

کبڈی:

کبڈی کا کھیل بھی ماشاء اللہ ربوہ میں خوب جوش و خروش سے کھیلا جایا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے ربوہ میں بعض بہت ہی عمدہ کھلاڑی ہوا کرتے تھے۔ جن میں، میرے زمانہ میں، خواجہ عبدالمومن صاحب آف ناروے، خواجہ عبدالباسط صاحب باچھا حال ناروے، جس کی دھول بہت ہی مشہور تھی، منصور احمد صاحب حال جرمنی جو کہ آجکل جرمنی میں صاحبِ فراش ہیں اور میرے کلاس فیلو تھے، مقصود احمد صاحب سودا حال انگلستان، بشارت احمد صاحب اعوان (بشارتی) حال

انگلستان، ثناء اللہ صاحب بھٹی اور چودھری سخی محمد صاحب وغیرہ میرے محلّہ کے اچھے کھلاڑی مانے جاتے تھے۔ باقی دوسرے محلّہ جات میں زیادہ تر قاسم خان صاحب، جو کہ بہت ہی عمدہ کھلاڑی تھے اور آل پاکستان ٹورنامنٹ میں ربوہ کی طرف سے نمائیندگی کیا کرتے تھے، ہاشم خان حال جرمنی اور شہاب الدین صاحب شاہی حال سویڈن وغیرہ تھے۔

جماعت میں کبڈی کو رواج دینے والے اور کبڈی کے روحِ رواں حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز تھے جو ہر سال ربوہ میں آل پاکستان کبڈی ٹورنامنٹ کا انعقاد کیا کرتے تھے۔ آپ بڑی محنت کے ساتھ ملک بھر سے کبڈی کے چوٹی کے کھلاڑیوں کو اکٹھے کر کے ربوہ لایا کرتے تھے۔ ٹورنامنٹ کے انتظامات کیلئے باقاعدہ کمیٹی مقرر کی جاتی تھی۔ میچ دیکھنے کے لئے ٹکٹوں کی فروخت ہوتی تھی۔ اسکے سیکرٹری مکرم محمد اعظم صاحب اکسیر ہوتے تھے اور ان کے نائب مکرم منیر الدین صاحب شمس ہوا کرتے تھے۔ شمس صاحب بتاتے ہیں کہ وہ مختلف شہروں میں جا کر احمدی بزنس مینوں سے جا کر عطیہ جات بھی وصول کیا کرتے تھے تا کہ ٹورنامنٹ کے اخراجات باحسن پورے ہوسکیں

کھلاڑیوں کو انعامات بھی دیئے جاتے تھے اور ٹورنامنٹ کے دوران ارد گرد کے دیہات سے بھی کثیر تعداد میں غیراز جماعت احباب دلچسپی سے شامل ہوتے تھے۔ اسی طرح اچھی کھیل پیش ہونے پر ڈھول بجائے جاتے تھے جس سے ایک میلہ کا سا سماں ہوتا تھا۔ لیکن تقسیم انعامات کی کاروائی ہمیشہ تلاوت قرآن کریم سے شروع کی جاتی تھی۔ تقسیم انعامات کیلئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ بھی تشریف لاتے رہے ہیں۔

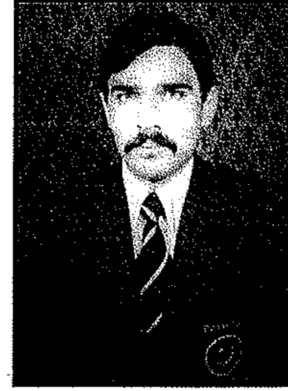
اس کبڈی ٹورنامنٹ میں بے شمار اعلیٰ کھلاڑیوں کو ہر سال دیکھنے کا اتفاق ہوا کرتا تھا جن میں پاکستان کے چوٹی کے کھلاڑی فتح محمد صاحب پھتا، توحید پٹھان، جمیل احمد صاحب فتح محمد صاحب کے چھوٹے بھائی مرحوم اور (بجلی)۔ فتح محمد صاحب جو کہ ایک احمدی کھلاڑی تھے۔ جس وقت میں نے

ان کی کبڈی دیکھی اس وقت آپ عمر کے اس حصہ میں تھے جبکہ انسان ریٹائرمنٹ کے قریب ہوتا ہے۔ پھر بھی آپ بے حد طاقت ور جاپھی تھے۔ توحید پٹھان صاحب بھی ایک انتہائی مضبوط اور گٹھے جسم کے کھلاڑی تھے۔ اُن کی کبڈی ڈالنا بھی دیکھنے کے لائق تھی۔ جب کوئی جاپھی اُن کو ہاتھ ڈالتا تو وہ جاپھی کے سینے کو دھکیل کر ایسے پیچھے کر دیا کرتے تھے جیسے کسی بچے کو دھکیل کر پرے کر دیا جائے۔ بڑے سے بڑا جاپھی بھی آپ کو پکڑ نہیں سکتا تھا۔

بجلی نامی کھلاڑی بھی ایک نری پھرتی تھا۔ وہ اپنی پھرتی اور تیزی کی وجہ سے کسی کو پکڑائی نہ دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا نام ہی بجلی پڑ گیا تھا وہ غالباً ریلوے کی طرف سے کھیلتے تھے۔ قاسم خان صاحب بھی اپنا سوتڑاں پہن کر اپنے جوہر دکھا رہے ہوتے تھے آپ کا جسم بھی بہت مضبوط اور سڈول تھا۔ چونکہ آپ ربوہ کے ایک نامور احمدی کھلاڑی تھے اس لحاظ سے ربوہ والوں کی ساری ہمدردیاں ان ہی کو جایا کرتی تھیں۔ میری ہوش سے پہلے کے کھلاڑیوں میں حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے علاوہ محمد دین صاحب عرف گگا تھے۔ گگا مرحوم مجھے ہمیشہ اپنی کبڈی کی داستانیں سنایا کرتے تھے بقول اُن کے کبڈی کا کھیل گگا کے بغیر ناممکن تھا۔ جہاں گگا ہوتا تھا وہاں لوگ ہوتے تھے اور جہاں گگا نہیں ہوتا تھا وہاں لوگ نہیں ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت کی چادر میں ڈھانپ لے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ باقی کبڈی کے موسم میں ہر محلّہ میں لڑکے اپنے اپنے طور پر کبڈی کھیلتے ہوئے دکھائی دیا کرتے اور زیادہ تر کبڈی ٹورنامنٹ سے پہلے اور اسکے ختم ہونے کے بعد تو خوب گہما گہمی رہا کرتی تھی اور ہر ربوہ کا لڑکا اس کھیل میں شائق نظر آیا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے ہمارے محلّہ میں بھی ہمارے گھر کے آگے ریت پر باقاعدہ ٹیمیں بنا کر پوری تیاری کے ساتھ یہ کھیل کھیلی جاتی تھی اور صبح صبح اُٹھ کر ورزشیں کیا کرتے تھے اور اگلے دن کے میچ کے لئے تیاری کیا کرتے تھے۔

باسکٹ بال:

باسکٹ بال کا کھیل بھی ربوہ میں بڑے عروج پر تھا۔ ربوہ میں اس کھیل کے موجد اور روحِ رواں حضرت مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ تھے۔ آپ نے اس کھیل کو تعلیم الاسلام کالج سے شروع کیا تھا اور کالج کی حدود میں اس زمانہ میں اعلیٰ



قسم کے دو کورٹ بنوائے تھے جہاں پر کالج کے کھلاڑیوں کے علاوہ ربوہ کے بھی بعض اچھے اچھے کھلاڑی جا کر کھیلا کرتے تھے۔ ہر سال ربوہ میں آل پاکستان ناصر باسکٹ بال ٹورنامنٹ منعقد ہوا کرتا تھا جس میں پاکستان بھر کی اچھی اچھی ٹیمیں اس ٹورنامنٹ میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ ان میں ایک ٹیم ربوہ کی بھی ہوا کرتی تھی۔ اس زمانہ میں ربوہ بھر میں بہت عمدہ کھلاڑی ہوا کرتے تھے جن میں میجر (ریٹائرڈ) سعید احمد چودھری، نصیر احمد بندہ صاحب، میجر (ریٹائرڈ) شاہد سعدی، مرزا عبدالباسط حال لندن مرزا صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ اُن کو اور ربوہ کی طرف سے گئی ہوئی ساری ٹیم کو خدا تعالیٰ کے فضل سے سارے پاکستان بھر میں اوّل آنے پر حکومتِ پاکستان کی طرف سے گولڈ میڈلز بھی ملے ہوئے ہیں مرزا عبدالباسط صاحب کی ٹیم میں چند کھلاڑیوں کے یہ نام ہیں شریف الرحمن، ادریس احمد، سجاد احمد، نیاز احمد، ظہیر احمد، اعزاز احمد (جاجا)، حافظ مسعود، طاہر احمد ورک اور میجر شاہد سعدی۔ ربوہ نے اس کھیل کے بیشمار نامور کھلاڑی اور سپوت پیدا کئے۔ الحمد للہ

باقی آل پاکستان ناصر باسکٹ بال ٹورنامنٹ کے اپنے ہی مزے تھے۔ ٹورنامنٹ کے دوران سارے ربوہ میں ہر طرف گہما گہمی ہوا کرتی تھی۔ ٹورنامنٹ کے زمانہ میں یہ کھیل ہر محلّہ میں کھیلا جاتا تھا اور مجھے بھی اپنے محلّہ میں لوگوں سے پیسے اکٹھے کر کے ریلوے لائن کے پاس دو پول لگانے کی توفیق ملی۔ جہاں پر چھوٹے چھوٹے بچے باسکٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ جنہیں پھر بعد میں ریلوے کے

کوارٹرز یا سٹور بن جانے کی وجہ سے گرا دیا گیا تھا۔

میرو ڈبّہ:

میرو ڈبّہ ایک ایسی کھیل ہے، جس کو سوائے احمدیوں کے دوسرے لوگ شاذ ہی جانتے ہونگے۔ اس کھیل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ سستی ترین کھیل ہے، جس میں دونوں ٹیموں کو ملا کر بارہ یا چودہ کھلاڑی بیک وقت کھیل سکتے ہیں اور اس کھیل میں ایک ٹینس کا گیند اور لکڑی کا ایک ڈنڈا استعمال ہوتا ہے۔ بالکل بیس بال جیسی کھیل ہے۔ یہ کھیل ربوہ کے علاوہ میرا نہیں خیال کہ کہیں اور جگہ بھی کھیلی جاتی ہے۔ ربوہ میں میرے زمانہ میں تو یہ کھیل ہر محلّہ میں زور شور سے کھیلا جاتا تھا۔ اور اتنا مشہور تھا کہ کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو میرو ڈبہ نہ کھیلتا ہو۔ اس کھیل میں بھی ربوہ نے بہت ہی عمدہ کھلاڑی پیدا کئے تھے۔ اس کھیل کے لئے تو باقاعدہ لمبے لمبے اور سیدھے سے لکڑی کے ڈنڈے ٹال سے بنوائے جاتے تھے۔ اس کھیل میں بھی اسی طرح حکمت عملی استعمال ہوتی ہے جیسے عام کھیلوں میں استعمال ہوتی ہے۔ بال دیتے وقت بڑی چالاکی دکھانی پڑتی ہے کہ دوسرا اس کے دیئے ہوئے بال کو ڈنڈے سے زور سے ٹھوکر نہ مار سکے۔ دوسرے بھاگتے ہوئے کھلاڑی کو دھوکا دے کر دھوڑی مارنا بھی ایک فن ہوتا ہے کہ وہ آپ کے آگے سے بچ کر دھایاں (حدود) پار نہ کر لے کہ دوبارہ وہ اس قابل ہو جائے کہ وہ باری لینے والا بن جائے۔ یہ کھیل بھی بہت ہی دلچسپ اور اپنے اندر ایک قسم کی جاذبیت رکھتا ہے۔ باقی جب باری لینے والوں کا آخری کھلاڑی رہ جائے تو اُس کھلاڑی پر بہت بھاری ذمہ واری پڑ جاتی ہے کہ جیسے بھی ہو وہ ضرور گیند کو ٹھوکر مارے تا کہ دائرہ میں پھنسے ہوئے کھلاڑی بھاگ سکیں۔ تو اُس وقت اچھے کھلاڑی اپنی فنکاری دکھاتے ہیں اور گیند کو مارنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ بجائے زور سے گیند کو مارنے کے بڑی چالاکی کے ساتھ ہلکی سی ایک سائڈ کو ٹھوکر مار کر خود اور اپنے ساتھیوں کو اس مشکل سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کھیل کے ربوہ میں بڑے بڑے عمدہ کھلاڑی ہوا کرتے تھے۔ میں اپنے منہ میاں مٹھو تو نہیں بنتا مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ میری دھوڑی سے شائد ہی کوئی بچا

ہوگا۔ میرا ربوہ کا پرانا دوست نصرت الٰہی حال انگلستان تو ہمیشہ میری دھوڑیوں کو یاد کرتا ہے اور ہمیشہ کہتا ہے یار حسن! تمہاری بٹھا کر دھوڑی مارنی مجھے نہیں بھولتی۔ میرے بہت عزیز معزز دوست مرزا محمد عبدالحکیم صاحب مرحوم حال انگلستان ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ حسن! مجھے تو ربوہ میں میرو ڈبہ کا جنون تھا اور میری کھیل تم نے نہیں دیکھی میں نے بھی یہ کھیل خوب کھیلی ہے۔ میں اُنہیں ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ مرزا صاحب پلیز اپنے واقعات مجھے لکھ کر دیں تا کہ میں اِن کو اپنے مضمون میں شامل کر سکوں مگر خدا تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔

رِنگ:

رنگ بھی ایک بہت ہی دلچسپ کھیل ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے یہ بھی سوائے ربوہ کے کسی اور شہر میں نہیں کھیلا جاتا۔ یہ کھیل ہمارے محلّہ کے علاوہ صدر محلّہ میں بھی بہت کھیلا جاتا تھا، اور بڑے زور شور سے کھیلا جاتا تھا۔ اس کے بھی باقاعدہ آل ربوہ ٹورنامنٹ ہوا کرتے تھے۔ مگر ایک بات ضرور تھی کہ صدر محلّہ کے دوست ہی اِس ٹورنامنٹ میں اوّل آیا کرتے تھے۔ وہ دو بھائی نصیر الدین عبیداللہ صاحب حال انگلستان اور اُن کے بڑے بھائی منیر الدین صاحب حال کینیڈا۔ جنہیں ربوہ میں بابائے رنگ کا خطاب ملا ہوا تھا۔

گُلی ڈنڈا:

گُلی ڈنڈا بھی ایک بہت ہی دلچسپ کھیل ہے مگر اس کھیل میں نقصانات بہت ہیں وہ اس لئے کہ اگر خدا نہ کرے کسی کو گُلی لگ جائے تو سر اور آنکھ بھی پھوڑ دیتی ہے۔ ویسے جب تک حضرت مصلح موعودؓ کی طرف سے اس کھیل کی باقاعدہ ممانعت نہیں ہوئی تھی یہ کھیل ربوہ میں ہر محلّہ میں کھیلی جایا کرتی تھی۔ ہمارے محلّہ میں تو بڑے زور وشور سے کھیلی جاتی تھی۔ ریلوے لائن کے پاس ایک چھوٹا سے پلاٹ تھا وہاں پر عموماً کھیلی جایا کرتی تھی۔ مجھے بھی یہ کھیل اچھے رنگ میں کھیلنے کی توفیق ملی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے ساتھ دو اور دوست تھے۔ ہم دائرہ میں بچیاں ڈال کر کھیل رہے تھے۔ اُس دن

میری پانچ بچیاں پڑ گئی تھیں تو پھر میں نے اپنے دوستوں کو خوب پدایا تھا۔ میں پداتا ہوا اپنے محلّہ سے دور ضیاء الاسلام پریس کے پاس بھٹے کے قریب لے گیا تھا۔ وہ بچارے گُلی کو کوشش کر کے ریت میں بھی پھینکتے مگر میں اپنے ایک ہی ٹُلے سے اُن کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتا تھا۔ تھک تو میں بھی بہت گیا تھا مگر اُن کی حالت میں نے بُری کر دی تھی۔ گلی ڈنڈا کے ذکر میں اگر میں ایک میرے بہت ہی لنگوٹیا دوست کا ذکر نہ کروں جو اس گیم کا شیدائی اور تھا تو بجا نہ ہوگا۔ وہ جناب منہاج النبی صاحب (مُنّی) ہیں۔ جن کی یہ کھیل ہمارے محلّہ تھی۔

گُلی ڈنڈا کے علاوہ رات کو آنکھ مچولی وغیرہ بھی خوب کھیلی جاتی تھی۔ ان سب اور بیشمار چھوٹی موٹی کھیلیں کھیلی جایا کرتی تھیں۔ بہر حال یہ کھیل بھی ربوہ میں کافی مشہور یادیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ مگر ان سب کو بیان کرنا مشکل ہے۔

شکاریات:

ربوہ میں شکار کرنے کا شوق تقریباً ہر چھوٹے بڑے کو ہوتا تھا۔ پہلے پہل تو غلیا پھر بعد میں کچھ حالات بدلے تو بعض صاحبِ حیثیت دوستوں نے ماں باپ سے ضد کر بندوقیں حاصل کر لیں۔ بعض بڑے شکار کا شوق رکھنے والے بندوق سے شکار کرتے بے شمار شکاری ہوا کرتے تھے۔ بعض تو پروفیشنل شکاری تھے جو کہ بارہ بور کی بندوق سے کا شکار کرنے دور دور جایا کرتے تھے۔ جن میں ہمارے ہمسایہ مکرم عبداللہ صاحب بر تھے۔ ان کا نشانہ اتنا تھا کہ وہ اڑتے ہوئے پرندوں کو گرا لیا کرتے تھے۔ آپ کے علاو بے شمار شکاری ہوا کرتے تھے۔

بندوق رکھنے والوں میں میرے بہت ہی عزیز بھائی اور دوست ظہیر الدین با

عرب نے اپنے والدین سے کہہ کر ایک بندوق خریدی ہوئی تھی جس سے وہ اور میں عموماً مختلف دیہات میں جا کر شکار مارا کرتے تھے۔نزدیکی دیہات کے علاوہ ہم چند دوست ملکر کبھی کبھار دور چک چھتالیس سرگودھا کے پاس جا کر شکار کرتے تھے۔وہاں پر کبوتر اور فاختائیں مارا کرتے تھے۔شکار کرنے کا اپنا مزہ ہوتا ہے صبح صبح منہ اندھیرے گھر سے نکلتے اور سارا سارا دن کھیتوں میں مارے مارے پھرتے پھر جا کر کہیں چند فاختائیں یا اور پرندے مار کر اُٹھائے واپس آیا کرتے تھے۔دیہات میں دیہاتی لوگ کبھی گالیاں دیتے اور کبھی اپنے کُتے ہمارے پیچھے ڈال دیا کرتے تھے۔مگر پھر بھی ہم ان سب مشکلات کے باوجود شکار کر ہی لیا کرتے تھے۔ایک دفعہ میں، میرے دوست ظہیر الدین بابر اور ایک دوست شکار کرتے بہت دور نکل گئے۔اُدھر ہمیں بہت شکار ملا۔اُس دن ہم نے اتنے کبوتر اور فاختائیں ماریں کہ ہمارے شکار کے تھیلے پوری طرح بھر گئے اور ہمیں تھیلے اٹھانے مشکل ہوگئے۔بڑی مشکل سے شکار اُٹھا کر گھر تک لائے۔

ربوہ میں پائے جانے والے پرندوں میں فاختائیں، کبوتر، گھریلو چڑیوں کے علاوہ ٹمیالی چڑیا جو کہ پہاڑوں کے قریب ہوا کرتی تھی اور گھریلو چڑیوں سے ذرا بڑی ہوتی ہے، مشہور ہیں۔سردیوں میں سرد علاقوں سے بعض پرندے اڑتے ہوئے ربوہ کے نزدیکی جوہڑوں میں آکر اپنی خوراک ڈھونڈھ رہے ہوتے نظر آتے تھے۔ہم اُن کو بھی بڑے شوق سے مارا کرتے تھے۔جن میں ممولے، کیوے، ہریل، نیل کانٹھ اور ٹٹیولی کے علاوہ تلیر تھے۔تلیریوں کے تو جُھنڈ کے جُھنڈ آیا کرتے تھے جن کا شکار ہم بڑے شوق کرتے تھے۔ان کے علاوہ مُرغابیاں بھی ربوہ کے قریبی علاقوں سے اُڑتی ہوئی آجایا کرتی تھیں۔جب کبھی کوئی مرغابی بھولی بسری ربوہ کی سرحد کے اُوپر سے اُڑتی ہوئی گذرتی تو ہمارے ربوہ کے کاگھ شکاری فوراً اپنی شاٹ گن اٹھائے اس کے پیچھے مارنے کو دوڑ نکلتے۔ان شکاریوں میں ہمارے ہمسایہ جناب عبداللہ صاحب برف بوتل والے تو اس کے ماہر تھے۔

شکاریوں کے ضمن میں اگر دو افراد کا ذکر نہ کیا جائے تو انصاف کا خون ہوگا۔میری مراد

صاحبزادہ مرزا منور احمد صاحب مرحوم اور صاحبزادہ مرزا انور احمد صاحب (انّو) سے ہے۔انہیں شکار کا بے حد شوق تھا۔لیکن ازراہ تفنن اور پیار میاں انّو کے متعلق یہی مشہور ہے کہ سارا دن شکار کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے اور کارتوس پر کارتوس چلاتے جاتے تھے لیکن اکثر خالی ہاتھ واپس آتے تھے۔

پکنک:

ربوہ میں شکار کرنے اور مچھلیاں پکڑنے کے شوق کے علاوہ گرمیوں میں نہر یا دریائے چناب کے کنارے پکنک منانے کا بھی بے حد شوق پایا جاتا تھا۔

یکّو والی بنگلہ کی نہر اور برُج کی نہر پر جا کر پکنک منانے کا اپنا مزہ تھا۔یکّو والے بنگلہ کی نہر جو کہ احمد نگر کی جانب تقریباً چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے احمد نگر سے یکّو والی نہر جاتے ہوئے ایک بہت ہی عمدہ اور کشادہ سڑک تھی جس کی دونوں اطراف شیشم اور کیکر کے بلند و بالا درخت ہوا کرتے تھے جہاں پر ہم راستہ میں شکار بھی مارا کرتے تھے جو کہ پھر ہم بعد میں نہر میں نہانے کے بعد بھون کر کھایا کرتے تھے۔اپنے ساتھ ہم اپنی سائیکلوں پر کھانے کا سامان اٹھا کر نہر پر خوشی خوشی پُل کے قریب اپنا ڈیرہ لگایا کرتے جہاں ایک ڈاک بنگلہ بھی تعمیر ہے۔وہاں پہنچتے ہی کھانے پینے کا سامان ایک مناسب جگہ پر رکھ کر ہم سب نہر کے پُل پر سے فوری چھلانگیں مارنی شروع کر دیتے۔اور سارا دن وہیں گزار کر واپس شام اپنے اپنے گھروں کو پہنچتے۔وہاں پر کھانا پکانے کا انتظام زیادہ تر ہمارے بہت ہی پیارے دوست جلال پلو صاحب مرحوم کے ذمہ ہوا کرتا تھا۔چونکہ یہ نہر ربوہ کے کافی قریب ہی واقع تھی اس لئے وہاں پر گرمیوں میں بار ہا دفعہ جایا کرتے تھے۔یکّو والی نہر کے علاوہ برج کی نہر پر بھی کئی دفعہ جانے کا اتفاق ہوا۔یکّو والی نہر تو ایک چھوٹی سی نہر تھی جسے بڑا کھال کہہ لیا جائے تو بہتر ہی ہوگا مگر برج کی نہر یکّو والی نہر سے بہت بڑی اور گہری تھی۔اس نہر سے دو تین چھوٹی چھوٹی نہریں اور نکلتی ہیں۔برج کی نہر پر جانے کے لئے کچھ زیادہ ہی لوازمات کرنے پڑتے تھے اُس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہ ربوہ سے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر تھی جہاں پر وقت زیادہ درکار ہوتا تھا اور حفاظتی سامان بھی کرنے لازمی تھے کیونکہ

وہاں کے قریبی دیہات کے لوگ کچھ زیادہ ہی ہمارے مخالف تھے۔ دوسرے وہاں پر جانے کے لئے ہمارے جیسے غریبوں کو ریلوے کا کرایہ بھی ادا کرنا پڑتا تھا جو کہ ہر آدمی کے لئے ممکن نہیں تھا۔ زیادہ تر وہاں اسکول یا کالج کے ٹرپ پر جایا کرتے تھے۔ باقی میرے جیسے کم تیراک وہاں جانے سے گھبرایا کرتے تھے مبادا کہ ڈوب جائیں۔ میرے ساتھ بھی ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا تھا وہ ایسے کہ بُرج کی نہر پر ایک دفعہ مجھے کسی نے کہا کہ حسن اگر تم اپنے ساتھ ٹیوب باندھ کر پانی میں چھلانگ لگا دو تو تم ڈوب نہیں سکتے۔ لہٰذا میں نے ایسا ہی کیا مگر جب میں نے اُس کے کہنے پر پانی میں چھلانگ لگائی تو میری ٹیوب مجھ سے چھوٹ گئی۔ مجھے چونکہ پوری طرح تیرنا بھی نہیں آتا تھا تو میں ڈوبنے لگا میں نے شور مچانا شروع کیا تو کوئی میری مدد کے لئے بھی نہ آئے کہ میں گویا مذاق کر رہا ہوں۔ بہر حال میں پھر بڑی مشکل سے پانی سے باہر آیا۔ جس سے میں بہت ڈر گیا اور پھر میں ہمیشہ ایسی حرکت سے باز رہا۔

ایک دفعہ ہمارے ٹی آئی کالج کا ٹرپ بُرج والی نہر پر گیا تو وہاں پر ایک لڑکا ڈوب گیا۔ یہ لڑکے کے ڈوبنے کا واقعہ میرے سامنے پیش آیا تھا۔ وہ ایسے کہ ہمارے کالج کا ٹرپ بُرج کے ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو اُس لڑکے کو نہ جانے کیا سوجھی کہ سیدھا نہر میں جا کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ بعد میں یہ مشہور ہو گیا کہ لاہور کا لڑکا پانی میں ڈوب گیا ہے۔ ہم سب بھاگے نہر کے قریب پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہ نہر کے بالکل درمیان میں موت کی کشمکش میں تھا جہاں پر اُس معصوم کو فوری مدد بھی دینے والا کوئی قریب نہ تھا۔ لہٰذا بعد میں اُس بے چارے کی لاش دور پانی کے گیٹ میں پھنسی ہوئی نکالی گئی۔ اس واقعہ کے بعد نہ تو کوئی کالج کا ٹرپ وہاں گیا اور نہ ہی ہمیں وہاں دوبارہ جانے کی ہمت ہوئی۔ یہ میرا آخری ٹرپ تھا۔

ہمارے محلّہ کی چند چیدہ چیدہ شخصیات

اِس عاجز نے محلّہ دار الرحمت غربی (غلہ منڈی) میں اپنا سارا بچپن گزارا۔ وہ جگہ جس کا ذرہ ذرہ ابھی بھی اسی طرح یاد ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ بعض اوقات اس کی یاد میں ایک لمبی آہ بھر کر ان

یادوں میں کھو جاتا ہوں کہ یہ وقت کیوں اتنی جلدی گذر گیا۔ آج بھی مجھے ہمارے محلّہ کی مسجد ناصر کی چٹائیاں یاد آتی ہیں جن پر ظہر کی نماز کے بعد ہم کچھ دیر ستانے کے لئے لیٹ جایا کرتے تھے یا پھر کبھی کسی بزرگ کی باتیں سُنا کرتے تھے۔ یا محلّہ کی مجلس اٹینڈ کرنے کے لئے ٹھہر جایا کرتے تھے۔ مسجد ناصر ہمیشہ نمازیوں سے بھری رہتی تھی۔ ایک وجہ تو ہمارے محلّہ کے دوکانداروں کی کثرت تھی جن کو لانے کا سہرا حضرت صوفی بشارت الرحمٰن صاحب مرحوم کے سر تھا جو کہ ہمیشہ دکانداروں کو نمازوں میں شمولیت کی تلقین کیا کرتے تھے۔ مجھے ابھی بھی بعض چہرے یاد ہیں جن میں ایک مبارک چہرہ جو ہر ایک نماز میں ہوا کرتا تھا، وہ چہرہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے جلیل القدر صحابی حضرت مولوی غلام رسول راجیکی صاحب مرحوم و مغفور کا تھا جن کا گھر ہماری مسجد کے بالمقابل تھا۔

اب خاکسار اپنے محلّہ کی بعض چیدہ چیدہ شخصیات کا ذکر کرنا چاہتا ہے۔

حضرت مولانا غلام رسول راجیکی صاحب

جلیل القدر صحابی حضرت مسیح موعود علیہ السلام



سفید کپڑوں میں ملبوس سر پر ڈھیلی ڈھالی گلے کے بغیر پگڑی پہنے ہمیشہ مسکراتا ہوا چہرہ۔ چوڑا اور گول نور سے بھرا ماتھا ہر نماز میں مسجد کی ایک سائڈ پر بیٹھے نظر آیا کرتے تھے۔ میں چھوٹا تھا جب مجھے آپ کے گھر جانے کا اتفاق ہوا آپ کے گھر میں کمروں کے آگے ایک صحن تھا جہاں پر آپ اپنی بیگم صاحبہ مرحومہ اور بیٹیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؓ کے گھر میں ایک حجرہ بنایا گیا تھا جو کہ آپؓ کے بیٹے عزیز راجیکی صاحب مرحوم نے بنوایا ہوا تھا۔

حضرت مولانا غلام رسول راجیکی صاحبؓ کی سیرت کے واقعات تو تقریباً ہر احمدی جانتا ہے۔ خاکسار صرف دو ایسے واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہے جن میں سے ایک کا تعلق خاکسار سے ہے اور

دوسرا واقعہ میرے ایک دوست نے بتایا ہوا ہے۔

ایک دفعہ گرمیوں کے دنوں میں یہ عاجز مسجد ناصر میں نماز ادا کرنے کے بعد پیاس بجھانے کی خاطر مسجد کے گھڑے سے پانی انڈیل کر بائیں ہاتھ سے پانی پی رہا تھا تو ساتھ ہی حضرت مولانا راجیکی صاحبؓ حسبِ معمول مسجد میں ایک دوست کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ آپ کی نظر مجھ پر پڑی جبکہ میں اپنے بائیں ہاتھ سے پانی پی رہا تھا تو آپؓ نے ساتھ والے دوست سے کہا کہ دیکھو یہ بچہ اپنے بائیں ہاتھ سے پانی پی رہا ہے۔ یہ غلط ہے۔ تو وہ آواز میرے کان میں پڑ گئی میں نے پانی کا گلاس یا جو بھی برتن تھا فوراً اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ کے پانی پینا شروع کر دیا۔ تو وہ وقت مجھے ابھی تک یاد ہے جبکہ مولوی صاحبؓ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور خوشی سے آپؓ نے اپنے ساتھ والے دوست سے بھی خوشی کا اظہار فرمایا۔ یہ تھی آپ کی خاموش نصیحت جو کہ مجھے ساری زندگی یاد رہی بلکہ ابھی بھی جب کبھی میں کوئی چیز پکڑنے لگوں تو آپ کی وہ نصیحت یاد آجاتی ہے۔ جیسے کل ہی کی بات ہو۔ باقی اس نصیحت کا میری زندگی پر ایسا اثر ہوا ہے کہ اس کے بعد جب کبھی میں گھر میں داخل ہوتا ہوں تو میں ہمیشہ پہلے اپنا دائیاں پاؤں رکھتا ہوں اور اپنے بچوں کو بھی یہی نصیحت کرتا ہوں۔

دوسرا یہ واقعہ مجھے میرے ایک دوست نے بتایا کہ محمد رمضان صاحب (مرحوم) حجام جو کہ ہمیشہ مولوی صاحبؓ کے گھر میں جا کر حجامت یا آپؓ کی ریش مبارک کا خط بنایا کرتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ رمضان صاحب مرحوم کو طلب کیا تو رمضان صاحب نے اپنے بڑے بیٹے سلطان کو (جو کہ میرا بہت ہی عزیز دوست تھا اور ایک ناگہانی موت سے دوچار ہوا خدا تعالیٰ اُس کی مغفرت فرمائے) حضرت مولانا راجیکی صاحبؓ کے گھر آپؓ کی حجامت کی غرض سے بھیج دیا۔ جب سلطان مولوی صاحبؓ کے گھر پہنچا تو مولوی صاحبؓ فرمانے لگے کہ سلطان اگر ذرا پہلے آجاتے تو تم بھی شاید حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دیکھ لیتے وہ ابھی میرے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ گویا یہ تھا آپؓ کا مقام۔

امتحانات کے بعد جب رزلٹ نکلنے کا وقت آتا تو لڑکے آپؓ کے پاس دُعا کے لئے جاتے تو آپؓ ہاتھ

اُٹھاتے ہی بتا دیتے کہ فلاں کے لئے میں نے روشنی دیکھی اور فلاں کے لئے نہیں گویا جس کے بارہ میں روشنی دیکھتے تو اس کا مطلب ہوتا کہ اُسکو امتحان میں کامیابی ہوگی اور جس کے بارہ میں روشنی نہیں دیکھی اُس کا مطلب ہوتا تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

صوفی بشارت الرحمٰن صاحب مرحوم ایم اے:

آپ کا گھر دفتر الفضل ربوہ کے ساتھ تھا۔ ایک سادہ سا گھر تھا۔ ان کی بیٹھک میں مجھے کئی دفعہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ آپ کی بیٹھک کی الماریاں کتابوں سے بھری رہتی تھیں۔ صوفی صاحب مرحوم ایک صوفی منش اور بزرگ انسان تھے۔ اپنی ساری زندگی جماعت کے لئے ہی وقف کر رکھی تھی۔ عربی کے ایک پایہ کے عالم اور پروفیسر تھے۔ آپ مسجد ناصر میں عموماً حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ ٹی آئی کالج میں ایک نمایاں شخصیت رکھتے تھے۔ آپ کچھ عرصہ ٹی آئی کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ خاکسار سے آپ بہت شفقت کا سلوک رکھتے تھے۔ اپنے حلقہ دارالرحمت غربی میں نیکی کو رواج دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ اُن کا ایک فقرہ سب منڈی والوں کو خوب یاد ہوگا کہ جب وہ منڈی کے دوکانداروں کو نماز کے لئے بلاتے تو فرمایا کرتے دوکانوں کو فوری بند کر کے مسجد میں چلو اور ساتھ فرماتے تمہیں معلوم ہے کہ اسلام خطرہ میں ہے۔ جب ہم بچے تھے لاعلمی میں کہہ دیا کرتے کہ صوفی صاحب کا اسلام تو ہمیشہ خطرہ میں ہی رہتا ہے۔ آپ کے دل میں احمدیت اور اسلام کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اُن کی باتیں تو بیشمار ہیں مگر اس وقت اِن سب کا ذکر کرنا مشکل امر ہے۔ جب اُن کا خیال دل میں آتا ہے تو اس بزرگ اور احمدیت کے اس فدائی کے لئے ڈھیروں دُعائیں دل سے نکلتی ہیں کہ اے اللہ تو اس نیک اور مخلص پر بے شمار رحمتیں نازل فرما اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرما۔ آمین

صوفی عطاء الرحمٰن صاحب مرحوم:

آپ صوفی بشارت الرحمٰن صاحب مرحوم کے والد ماجد تھے۔ نہایت ہی صوفی منش

اور بزرگ انسان تھے۔ میں اُن کو ہمیشہ نانا جی کہا کرتا تھا کیونکہ وہ میرے ہمسایہ ظہیر الدین بابر آف سعودی عرب کے نانا جان تھے میں ان کی وجہ سے نانا جی ہی کہا کرتا تھا۔ ان کی نیکی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ گرمیوں کے دنوں میں ساری ساری رات گھر سے باہر گراؤنڈ میں کپڑے بچھا کر عبادت کیا کرتے تھے۔ باقی میری اور بابر کی یہ ڈیوٹی تھی کہ اُن کے لئے رات سے پہلے پہلے زمین کو صاف کر کے پانی وغیرہ کا چھڑکاؤ کر کے انکے لئے زمین کو ٹھنڈا کر دیا جائے تا کہ وہ آسانی سے ساری رات عبادت کر سکیں۔ ان کے بارہ اُن کے بیٹے مبشر احمد صاحب حال انگلستان نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ وہ ایسے ہی اپنے دوستوں کے ساتھ دُعائیں کر رہے تھے تو اُن کے ہاتھ میں شہد آ گیا تھا جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک معجزہ تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اُن کی ساری دُعائیں مجھ گناہگار کے حق میں بھی قبول ہو جائیں۔

کیپٹن سعید احمد صاحب مرحوم:

آپ فوج سے ریٹائرڈ کیپٹن تھے۔ ہمارے محلّہ دارالرحمت غربی کے کئی سال صدر بھی رہے۔ بہت ہی ہمدرد اور بارعب انسان تھے۔ آپ نے بڑے ہی اخلاص سے ہمارے محلّہ کی خدمت کی۔ بہت ہی غریب پرور انسان تھے۔ اُن کے ایک بیٹے سلیم احمد صاحب حال ربوہ ہیں جو کہ خاکسار کے جگری دوست تھے اور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کیپٹن سعید صاحب مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔

قریشی عبدالغنی صاحب مرحوم:

آپ کا گھر مسجد ناصر سے صرف چند قدموں کے فاصلہ پر اور لنگر خانہ کی دیوار سے ملحقہ تھا۔ قریشی صاحب مرحوم پانچ وقتہ نمازی، انتہائی نیک اور خاموش طبع شخصیت تھے۔ آپ کی ساری اولاد بھی آپ کی طرح ماشاء اللہ نیک، ہمدرد اور سلسلہ کی فدائی ہے۔ آپ کے ماشاء اللہ پانچ بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے پروفیسر عبدالجلیل صاحب صادق کے علاوہ عبدالرشید صاحب (کاکا)، عبدالحلیم صاحب، عبدالصمد

صاحب اور مبشر احمد صاحب ہیں۔ عبدالجلیل صاحب صادق آجکل انصار اللہ مرکزیہ ربوہ کے قائد صحتِ جسمانی کے طور پر جماعت کی خدمات بجالا رہے ہیں۔

مولوی یٰسین صاحب جہلمی مرحوم:

آپ میرے بہت ہی شفیق استاد تھے اور ریلوے سٹیشن کے قریب لنگر خانہ میں ایک کمرہ میں رہائش رکھتے تھے۔ آپ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے نیز قرآن مجید کے ترجمہ اور تفسیر پر بہت عبور حاصل تھا۔ میں اُن کے پاس جا کر قرآنِ مجید پڑھا اور ترجمہ سیکھا کرتا تھا۔ مجھے بہت پیار سے وقت نکال کر بھی پڑھایا کرتے تھے۔ مجھے ہمیشہ کہا کرتے حسن! تمہارا باپ میرا بہت عزیز دوست تھا تم مجھ سے اپنے باپ مرحوم کی فارسی زبان بھی سیکھا کرو۔ آپ ایک ٹانگ سے معذور تھے مگر میں نے جب بھی دیکھا ہمیشہ لنگر خانہ یا لنگر خانہ کے باہر سڑک پر اپنے رمبے سے کام کر رہے ہوتے تھے۔ خدا تعالیٰ ان پر ہمیشہ بے شمار اپنی رحمتیں نازل فرماتا رہے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

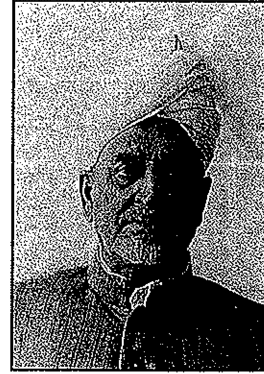
حکیم رحمت اللہ صاحبؓ:

یہ صحابہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام میں سے تھے۔ ہمارے محلّہ میں خان میر خان صاحب مرحوم کی دکان کے پاس ایک چھوٹے سے کمرہ میں اپنی حکمت کرتے تھے۔ باوجودیکہ آپ نوے سال کی عمر کے لگ بھگ تھے پھر بھی اتنے مضبوط تھے کہ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ریلوے لائن کے پاس کئی کئی ڈنڈ نکالا کرتے تھے۔ بارہا دیکھا گیا کہ آپؓ اپنا بڑا سا سوٹا زمین میں گاڑے لگاتار ڈنڈ نکال رہے ہوتے تھے۔

مسجد ناصر میں نماز کے لئے ذرا دیر ہو جاتی تو دیکھنا کہ لوگ نماز سے واپس آ رہے ہیں۔ تو ہمارا فوراً خیال اِس طرف چلے جانا کہ یہ نماز یقیناً [illegible] صاحب [illegible] نے پڑھائی ہو گی۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ آپؓ نماز بہت جلدی جلدی پڑھایا کرتے تھے۔ تا کہ کہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کی نافرمانی

کے مرتکب نہ ہوں۔

چودھری فرزند علی صاحب مرحوم:



آپ کا اونچا لمبا قد تھا۔ بارعب شخصیت تھی۔ سر پر گُلّے والی پگڑی پہنے اور سفید کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے۔ اس لئے آپ کی چال ڈھال میں جاگیرداری رعب نمایاں تھا۔ مگر ہمیشہ ہنس کر بات کرتے۔ پانچ وقت کے نمازی، نیک و صالح اور ایک ہمدرد دل رکھنے والے انسان تھے۔ سلسلہ کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ آپ ہمارے محلّہ کی ایک نمایاں شخصیت تھے۔ آپ کی اہلیہ مرحومہ بھی آپ کی طرح ہمارے محلّہ کی ایک فعال شخصیت تھیں اور صدر محلّہ بھی کئی عرصہ تک رہیں۔ چودھری ہادی علی صاحب مربی سلسلہ آپ کے بیٹے ہیں جو اس وقت انگلستان میں جماعت کی خدمت کر رہے ہیں انہیں کافی عرصہ تک حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے بھی کام کرنے کی توفیق ملی۔

حکیم فضل الٰہی صاحب مرحوم:

آپ ہمارے محلّہ میں آنے سے قبل ایک لمبا عرصہ سیلون میں کام کی غرض سے مقیم رہے۔ آپ بھی ہمارے محلّہ کی ایک بہت ہی اہم شخصیت تھے۔ پانچ وقت کے نمازی اور جماعت کی بے لوث خدمت کرنے والے انسان تھے۔ بہت ہی پیار کرنے والی شخصیت تھی۔ آپ ہمارے محلّہ میں بچوں کو قرآنِ مجید باقاعدگی سے پڑھایا کرتے تھے۔ آپ کی اولاد میں سے بڑے بیٹے نصرت الٰہی انگلستان میں برسرِ روزگار ہیں جو کہ میرے بہت ہی پیارے دوست بھی ہیں۔ آپ کے بچوں میں نصرت الٰہی کے علاوہ لطف الٰہی، مقبول الٰہی پاشی اور احسان الٰہی ہیں۔

روشن دین تنویر صاحب مرحوم:

سابق ایڈیٹر الفضل ربوہ۔ ایک منجھے ہوئے شاعر تھے۔ آپ کے اشعار ہمیشہ الفضل کی زینت ہوتے تھے۔ صوفی منش درویش اور خاموش طبع انسان تھے۔ جسم گول مٹول اور بہت ہی پیاری شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کے ایک بیٹے انگلستان میں رہتے ہیں۔

سیّد ولایت حسین شاہ صاحب مرحوم:

آپ ہمارے ہمسایہ میں رہتے تھے۔ بہت ہی پیار کرنے والی شخصیت ایک نمازی اور درویش صفت انسان تھے۔ آپ کی ایک چھوٹی سی دوکان ہوا کرتی تھی جس میں آپ بچوں کے لئے ٹافیاں اور سویٹ وغیرہ بیچا کرتے تھے۔ خاکسار سے آپ بہت پیار سے پیش آیا کرتے اور مجھے اپنی دوکان کی سویٹس وغیرہ بڑے شوق سے پیش کیا کرتے تھے۔ میں اکثر آپ کے گھر جایا کرتا تھا۔ آپ کے دو بیٹے تھے۔ جن میں ایک سیّد کرامت اللہ صاحب اور سید ہدائت اللہ صاحب ہادی ہیں۔ (ہدایت اللہ صاحب ہادی آجکل کینیڈا میں برسرِ روزگار ہیں۔ جب ایک دفعہ خاکسار کو کینیڈا جانے کا اتفاق ہوا تو ہادی صاحب نے خاکسار کو اپنے گھر مدعو کیا۔ خاکسار کو آپ کا بڑا سا گھر دیکھ کر دلی خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے احمدیت اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی برکت اور نیک ماں باپ کی دُعاؤں سے ہم ربوہ والوں کو کیا رنگ عطا کر دیئے ہیں۔ ویسے ہادی صاحب کینیڈا جماعت کے لئے ماشاء اللہ کام بھی بڑے اخلاص سے کرتے ہیں۔ آپ ماشاء اللہ ایک منجھے ہوئے اردو نویس ہیں نیز کینیڈا سے نکلنے والے احمدیہ اخبار کے مدیر بھی ہیں، جس میں آپ کے اچھے اچھے مضامین پڑھنے کا بھی کبھی کبھار اتفاق ہو جاتا ہے۔ آپ اپنے باپ کی طرح بہت ہی ملنسار اور ہمدرد انسان ہیں)۔

پروفیسر محمد دین صاحب ایم اے مرحوم:

آپ تعلیم الاسلام کالج میں تھیالوجی پڑھایا کرتے تھے۔ خاکسار کو بھی ٹی آئی کالج میں آپ

سے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ آپ ہماری مسجد ناصر کے مستقل امام الصلوٰۃ بھی تا حیات رہے۔ آپ ایک عالم فاضل اور ہمدرد انسان تھے۔ آپ بہت ہی ہنس مکھ اور بھولی بھالی طبیعت کے مالک تھے۔ نمازیں بڑی باقاعدگی سے پڑھایا کرتے تھے۔ آپ نماز بڑی خوش الحانی سے پڑھاتے۔ مجھے یاد ہے آپ مغرب کی نماز میں سورۃ الفیل اور سورۃ الناس اور عشاء کی نماز میں زیادہ تر سورۃ الضحیٰ اور سورۃ التین پڑھایا کرتے تھے۔

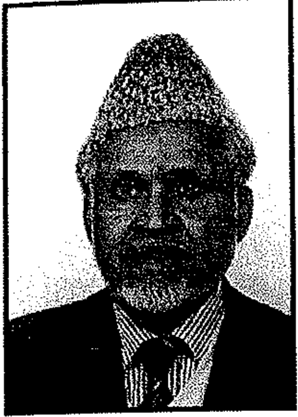
پروفیسر عبدالرشید غنی صاحب ایم اے:

آپ محلّہ دارالرحمت وسطی میں حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری مرحوم کے ہمسایہ میں رہتے تھے۔ غالباً اب بھی وہیں ہی رہتے ہوں۔ آپ ٹی آئی کالج میں حساب پڑھاتے اور کالج کی ہاکی ٹیم کے انچارج تھے۔ آپ کو ہاکی سے بہت اُنس تھا۔ ہمیں ہاکی بڑے شوق سے کھلاتے اور ہر کھلاڑی کی ضرورت کو پورا فرماتے۔ ہر ایک کی بات بڑے پیار سے سنتے اور آپ نے ہم پر کبھی بھی رعب نہیں جمایا، نہ ہی کبھی جھڑکا بلکہ ہمیں اپنے گھر بلا کر ہم سب کو چائے وغیرہ پلاتے اور خوشی خوشی اگلے میچ کی پلاننگ ہمارے ساتھ مل کر کرتے تھے۔ گراؤنڈ میں خود بھی نیکر پہن کر ہمارے ساتھ کھیلتے اور ہمارے ساتھ خود کھیل کر ہماری کوچنگ کرتے۔ آپ بہت ہی ہنس مکھ، ہمدرد اور مہمان نواز انسان ہیں۔ ہاکی کی بے شمار یادیں آپ کے ساتھ وابستہ ہیں جو کہ وقت کی کمی کی وجہ سے بیان میں لانی مشکل ہیں۔ جماعتی کاموں میں بھی آپ ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ آپ مجلس انصار اللہ ربوہ مرکزیہ کے سیکرٹری مال تھے۔ سنا ہے کہ آپ کینیڈا چلے گئے ہیں لیکن وہاں آپ کا دل نہیں لگتا اور یہی کوشش ہے کہ واپس ربوہ چلے جائیں۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سدا خوش و خرم ہی رکھے اور اپنے بے شمار فضلوں کا وارث بنائے۔ آمین

پروفیسر محمد احمد صاحب انور ایم اے:

آپکو بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے ۱۹۵۹ سے ۱۹۷۲ تک ٹی آئی کالج میں اردو اور دینیات

کے علاوہ باسکٹ بال کی سرپرستی حاصل رہی۔ میں ذاتی طور پر آپ کو جانتا ہوں آپ بھی ایک چاق و چوبند رہنے والی شخصیت تھے۔ آپ کو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑا عرصہ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ کالج میں متعدد عہدے آپ کے سپرد تھے۔ باسکٹ بال اور دیگر ورزشی کھیلوں کے



علاوہ کشتی رانی کے بھی آپ انچارج تھے۔ جس وقت آپ کو دیکھنے کا میرا اتفاق ہوا آپ ماشاء اللہ ایک بہت پُھرتیلے مجاہد تھے۔ ۲۰۰۱ء میں جرمنی کے جلسہ سالانہ میں مجھے آپ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ۱۹۸۹ء سے جرمنی میں رہائش پذیر ہیں۔ مجھے مل کر بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ جو جو بھی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل اور رحمتیں اور ترقیات فرمائی ہیں وہ صرف اور صرف میرے پیارے امام حضرت مرزا ناصر احمد خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ کی شفقت اور دُعاؤں ہی کا صلہ ہے۔ بیشک آپ جماعت کے لئے ایک بہت ہی درد رکھنے والے ایک مخلص اور ہمدرد اور شفیق انسان ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کو ۱۹۷۳ سے ۱۹۸۹ء تک افریقہ میں بھی کالج میں پڑھانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ الحمدللہ

الحاج محمد افضل خان صاحب تُرکی (ربوہ کا پہلا پھل)

آپ کے بارہ میں اُن کی اپنی زبانی بیان کرنا چاہوں گا کیونکہ آپ کی شخصیت کے بارہ خاکسار کو زیادہ علم نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "میں ترکوں کے اُغور قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا نام الحاج محمد افضل خان تُرکی ہے۔ مگر میں احمدیوں میں تُرکی (صاحب) کے نام سے مشہور ہوں۔ شرقی تُرکستان کے صوبہ خُتن کے رئیس خان بہادر بدرالدین خان صاحب میرے دادا الحاج بہاء الدین خان صاحب مرحوم کے بڑے بھائی تھے۔ یہ دونوں بھائی مختلف وقتوں میں برٹش گورنر رہے ہیں۔ خان بہادر بدرالدین خان صاحب کو خان بہادر کا خطاب کنگ جارج پنجم نے اس خوشی میں دیا تھا کہ انہوں نے

ایک سوئس مشنری کواور انکے بیوی بچوں کو یارقند کے شہر میں عبداللہ خان نامی وار لارڈ نے زنجیروں سے باندھ رکھا تھا اور اُنکو مکوں اور ٹھڈوں سے مارتا تھا اور کہتا تھا کہ تم ہمارے مذہب کو خراب کرنے ہمارے ملک میں آئے ہو۔ اور قریب تھا کہ وہ اُنکو قتل کر دیتا۔ اُس وقت خان بہادر صاحب ختن سے آئے اور اُن کو اس مصیبت سے نجات دِلوا کر اُنکو اُنکے ملک سوئٹزر لینڈ بخیر وعافیت واپس پہنچا دیا۔ یہ واقعہ 1933ء کا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ کمیونسٹوں نے 1945 میں خان بہادر بدرالدین خان صاحب کو گلگت کی سرحد پر لا کر گولی سے مار کے شہید کر دیا تھا۔ حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے مجھے ایک ملاقات کے موقعہ پر فرمایا کہ اُن کے شہید ہونے کی خبر سارے ہندوستان کے اخباروں میں چھپی تھی۔



الحاج بہاؤالدین خان صاحب مرحوم پہلے کاشغر کے صوبہ میں برٹش گورنر تھے بعد میں سلک روڈ کے سلسلہ میں اُنکو لداخ میں اقستال بنا کر بھیجا تھا۔ (اقستال تُرکی زبان میں گورنر کو ہی کہتے ہیں اور چیف کے مطلب میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔

1945ء میں جب ہزاروں لاکھوں ترکستان کے تُرک مہاجر ہو کر باہر نکلے تو بہاؤالدین خان صاحب کو بھی لداخ میں ہی اُنکی مرضی کے مطابق آباد کر دیا گیا۔ اور خان آف لداخ کا اُنکو خطاب ملا۔ ''ربوہ کا پہلا پھل'' خطاب مجھے اُس دن ملا تھا جبکہ حضرت امیر المومنین مصلح موعودؓ کے دستِ مبارک پر ربوہ شہر میں مجھے بیعت کرنا نصیب ہوئی۔ جبکہ حضور ربوہ کی سنگِ بنیاد رکھنے 1948ء میں تشریف لائے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے وہاں پر بیعت کی توفیق بخشی اور اب میرے بعد احمدیوں کی تعداد ماشاءاللہ کروڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ اُس وقت میری عمر صرف چودہ یا پندرہ سال کی تھی۔''

مکرم نور احمد صاحب عابد:

آپ پانچ وقتہ نمازی، ہمدرد دل رکھنے والے خاموش طبع محنتی اور سلسلہ کے سچے فدائی ہیں۔ آپ نے اپنی ساری زندگی جماعت کی خدمات میں صرف کی۔ خاکسار کے اصرار پر ان کے بیٹے نصیر احمد صاحب عابد حال انگلستان نے اُن کے بارہ مختصر اُحالات اکٹھے کر کے مجھے دیئے ہیں۔ ان چند سطور کو خاکسار اپنے اس مضمون میں شامل کرنا اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

جب ۱۹۶۰ء میں ٹاؤن کمیٹی ربوہ کی تشکیل ہوئی تو آپ کو ۱۹۶۲ء میں ڈپٹی کمشنر صاحب جھنگ کے ذاتی حکم سے ٹاؤن کمیٹی ربوہ کا پہلا سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ ٹاؤن کمیٹی کا دفتر ایک کرایہ کے مکان میں تھا جو کہ پھر بعد میں دو جولائی ۱۹۶۵ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی حکم سے کمیونٹی ہال اور دفتر ٹاؤن کمیٹی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ آپ نے چھ سال مسلسل ٹاؤن کمیٹی ربوہ کے سیکریٹری کے عہدے پر کام کیا، اس دوران آپ کی مسلسل کوششوں سے ۱۹۶۸ میں ربوہ کو سوئی گیس کا بھی حصول ہوا۔ جبکہ اُس وقت تک چنیوٹ سوئی گیس کے حصول میں ناکام رہا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۸ء میں آپ کا تبادلہ بطور ٹیکسیشن ڈسٹرک کونسل جھنگ ہو گیا۔ آجکل آپ اس عہدے سے ریٹائرڈ ہو کر ربوہ میں ہی رہائش پذیر ہیں۔



آپ کی روایت ہے کہ ۱۹۵۱ کی مردم شماری کی رو سے ربوہ کی کل آبادی 2679 تھی پھر ۱۹۶۱ میں بڑھ کر 9991 ہو گئی اور ۳ ستمبر 1954 کو بذریعہ پنجاب گزٹ نوٹیفکیشن ربوہ کی میونسپل کمیٹی درجہ دوم بنادی گئی۔

آپ کے بیٹے نصیر احمد صاحب عابد حال انگلستان ماشاءاللہ نائب زعیم اعلیٰ انصاراللہ لندن ریجن کی خدمات بجالا رہے ہیں نیز جماعت کے ایک فعال خادم ہیں اور انصاراللہ کی طرف سے کوئی بھی تقریب ہو آپ ہمیشہ وقار عمل کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔

سیّد محمد نور صاحب مرحوم:

میرے پیارے ماموں جان مرحوم ابن سیّد احمد نور کابلیؓ مرحوم ربوہ کی ایک بہت ہی معروف شخصیت تھے۔ اپنے روزگار کے زمانہ میں آپ کا زیادہ تر وقت کراچی، پشاور، ایبٹ آباد اور پاڑہ چنار میں گزرا۔ آپ کا پیشہ معدنیات کو ڈھونڈھنا تھا۔ آپ کے پاس ہمیشہ بہت ہی خوبصورت اور قیمتی



پتھروں کے نمونوں کے تھیلے بھرے رہا کرتے تھے۔ جنہیں ہم بعض اوقات دیکھا کرتے تھے۔ جب ہم آپ سے پوچھتے کہ ماما! کیا آپ کو ہر ایک پتھر کا پوری طرح علم ہے کہ کس پہاڑ سے آپ نے نکالا ہے اور کتنی مقدار میں اس پہاڑ میں یہ پتھر موجود ہے؟ تو آپ فوراً فرماتے کہ مجھے ہر ایک پتھر کے بارہ پورا پورا علم ہے، یہی تو میرا کام ہے۔

آپ پنج وقتہ نمازی، تہجد گزار اور بہت ہی غریب پرور تھے۔ آپ نے اپنی آمدنی میں سے بہت سے غرباء کا وظیفہ بھی لگایا ہوا تھا جن کو آپ باقاعدگی سے رقوم بھیجا کرتے تھے۔ غریبوں کی مدد کا مادہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس بارہ میں ایک واقعہ یوں ہوا کہ آپ کی وفات کے چند دنوں کے بعد محلّہ کے بھکاری ہمارے گھر کے باہر دروازہ پر آکر رونا شروع ہو گئے۔ جب میری ہمشیرہ نے اُن سے رونے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے بی بی ہم آپ سے کچھ مانگنے نہیں آئے بلکہ ہم تو شاہ صاحب کی وفات پر تعزیت کے لئے آئے ہیں۔ آپ نے ہمیں کہا ہوا تھا کہ تم لوگ میرے گھر نہ آیا کرو بلکہ وہ خود ہمارے اڈوں پر آکر ہماری مدد کر دیا کریں گے۔ آج ہمیں ان کی وفات کا علم ہوا ہے تو ہم آ گئے ہیں۔ پھر کافی دیر تک روتے رہے اُس کے بعد واپس چلے گئے۔

آپ کی وفات سے ایک ماہ پہلے مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ ربوہ جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے ملکر فرمانے لگے! احسن تم نے اچھا کیا جو آ گئے ہو میں یاد ہی کر رہا تھا۔ گویا آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی وفات کا پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔

آپ موصی تھے لہٰذا آپ کی تدفین بہشتی مقبرہ میں ہوئی۔

سیّد احمد نور صاحب کابلیؓ مرحوم:

میرے پیارے نانا جان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ ۱۹۰۳ء میں بمع اپنے اہل وعیال اپنے وطن افغانستان سے ہجرت فرما کر قادیان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

آپؓ کے والد ماجد کا نام سیّد اللہ نور تھا۔ آپؓ گاؤں جدران جو کہ سرحد اریوب کے قریب واقع ہے کے رہنے والے تھے۔

آپؓ فرماتے ہیں کہ ”ایک بار ایک حاجی میرے پاس مہمان کے طور پر میرے گھر ٹھہرا وہ حج کر کے آیا تھا میں نے اُس سے حج اور مکہ معظّمہ کی باتیں دریافت کیں تو اُس نے بیان کرتے کرتے کہا کہ ہندوستان میں ایک شخص ہے وہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف ہوں اور میں اِس زمانہ کے



لئے مامور ہو کر آیا ہوں عیسیٰ بن مریم ہونے کا بھی مدّعی ہے۔ تب میں نے حاجی صاحب کو کہا کہ آپ وہاں گئے تھے؟ اُنہوں نے کہا کہ گیا تو نہیں، سُنا ہے۔ میں نے کہا تم گواہ رہنا کہ میں اُس پر ایمان لے آیا ہوں۔ اور سچا یقین کرتا ہوں۔ حاجی نے کہا واہ بھائی نہ تو آپ نے دیکھا ہے اور نہ تحقیق کی صرف سُن کر ایمان لے آئے یہ کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا اُس کا دعویٰ سچا ہے۔ اگر پہاڑ یہ دعویٰ کرے اور حق پر نہ ہو تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ اگر تم نے سچا حج کیا ہے تو تم بھی مان لو گے اگر نہیں تو رہ جاؤ گے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد اُس نے بھی مان لیا“۔

ایک اور جگہ آپؓ فرماتے ہیں ”میرے والد صاحب ہمیں کہا کرتے تھے کہ مشرق کی طرف سے آسمان سے ایک نور اُترا ہے تم لوگ مشرق کی طرف چلے جاؤ۔ کاش میں بھی اُس وقت زندہ ہوتا تو

میں بھی جاتا۔ میں بچپن سے ہی اللہ اور رسولؐ سے محبت رکھتا تھا۔ میں نے اپنے والد صاحب سے کہا کہ مجھے بھی اپنا مرید بنالو کیونکہ اُس وقت میرے والد صاحب لوگوں سے بیعت لیا کرتے تھے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ تمہارا مرتبہ اس سے بلند ہے کہ مرید بنو"۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں "جب میں بڑا ہوا تو غزنین، کابل، تیراہ اور پشاور وغیرہ مختلف جگہوں میں علم پڑھا۔ آخر میں شہید مرحوم (سیّد عبداللطیف شہیدؓ) کے پاس گیا اور اُن سے ملاقات ہوئی اور اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شہید مرحوم میرے ساتھ محبت رکھتے تھے اور معرفت کی باتیں سُنایا کرتے تھے۔ کسی نے میرے والد صاحب سے کہا کہ تمہارا بیٹا مولوی عبداللطیف صاحب کے پاس گیا ہے اور اُن کی بیعت بھی کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ سفید کپڑوں والا تھا اور سفید کپڑے والوں سے مل گیا۔

آپؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ طالبِ علموں نے عرض کی کہ آپؓ جب کچھ فرماتے ہیں تو احمد نور کی طرف کیوں مخاطب ہوتے ہیں اور ہماری طرف مخاطب نہیں ہوتے آپؓ (شہزادہ عبداللطیف صاحب شہیدؓ) فرماتے رفیق ہمارا ہے۔ آپؓ نے یہ بھی طلبہ سے فرمایا کہ احمد نور کی یہ حالت ہے کہ جب بخاری شریف شروع کی جاتی ہے تو یہ ایک وادی کی شکل بن جاتا ہے اور حدیث پانی کی طرح اس کے اندر چلی جاتی ہے اس لئے اس کو مخاطب کرتا ہوں"۔ (بحوالہ چشمدید واقعات شہزادہ عبداللطیف شہیدؓ از سید احمد نور کابلیؓ)

آپؓ ۱۹۰۳ء میں بمع اپنے اہل وعیال کے افغانستان سے ہجرت کر کے قادیان پہنچے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ آپؓ فرماتے ہیں کہ "جب حضرت صاحبؑ اور میں گورداسپور آتے جاتے تو میں پیدل یکہ کے ساتھ دوڑتا ہوا جاتا اور دوڑتا ہوا آتا۔ جب حضرت صاحبؑ دہلی، سیالکوٹ اور لاہور وغیرہ کہیں جاتے تو مجھے اپنی جگہ پر امین کے طور پر حفاظت کے لئے چھوڑ جاتے"

آپؓ صاحبِ الہام وکشوف تھے۔ گھر میں کوئی بھی مشکل درپیش ہوتی تو فوراً اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو جاتے اور نوافل ادا کرتے اور جلد ہی مشکل کے دور ہونے کی خوشخبری سُنا دیتے۔ میرے

کزن مجھے بتاتے ہیں کہ جب ربوہ نیا نیا بنا تھا ہمیں چنیوٹ تعلیم کی غرض سے جانا ہوتا تھا۔ ہمیں مشکل ہوتی تھی۔ تو ایک دن ہم نے ابا (یعنی ہمارے نانا ابا) سے کہا کہ ہم بھائی بڑی مشکل سے چنیو سکول جاتے ہیں ہمیں کوئی سائیکل لے دیں۔ کہنے لگے بچو! صبر کرو میں نے آپ سب کو اپنی کار د میں بیٹھے دیکھا ہے۔

یہ آپؓ ہی کی دعا کا نتیجہ ہے کہ اب خدا کے فضل سے ہر ایک کے پاس کار ہے۔ (روایت بشارت نور صاحب حال یو کے)

آپؓ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی پارٹیشن کے وقت اپنے بچوں کے ساتھ قادیان سے پ لاہور پھر لاہور سے ربوہ تشریف لائے اور ۱۹۵۲ء میں آپؓ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اور ا پیچھے ہمارے لئے دُعاؤں کا ایک خزانہ چھوڑ گئے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

غلّہ منڈی کے دکاندار احباب

چودھری محمد بوٹا صاحب مرحوم:

آپ فرشتہ صفت ہمیشہ سچی اور کھری بات کہنے والے تھے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس رہتے اور سر پر بھی سفید رنگ کی پگڑی پہنا کرتے تھے۔ گورا چٹا رنگ نیک متقی، نمازی پرہیز گار ہمدرد اور بہت پیار کا سلوک کرنے والے ہنس مکھ انسان تھے۔ آپ کی غلّہ منڈی میں آڑھت کا کام کرتے تھے نیز پرچون کی بھی دکان تھی۔ آپ کے اخلاق اور اوصافِ حمیدہ کی جتنی بھی تعریف کروں وہ میں کم ہی سمجھتا ہوں۔ آپ کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ آپ کی بیگم کو میں اماں جی کہا کرتا تھا۔ آپ بھی اپنے خاوند کی طرح ایک فرشتہ صفت انسان تھیں۔ آپ میں بھی اپنے خاوند کی طرح ایک ہمدرد دل تھا جو ہمارے جیسوں کے لئے ہمیشہ کشادہ رہتا تھا۔ ہمارے ہمسایہ دار ہونے کے ناطے میں اور میری بہنیں ہمیشہ ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ آپ ہم سے بہت پیار کا سلوک کیا کرتی تھیں۔ میں جب بھی کہتا اماں جی!

میں نے آپ کے ہاتھ کی خمیری روٹی کھانی ہے تو آپ فوراً مجھے بنا کر دیتیں۔ ماؤں سے بھی بڑھ کر آپ پیار کرنے والی خاتون تھیں۔ آپ کے ماشاء اللہ سات بیٹے ہیں جو کہ بالترتیب، چوہدری مبارک احمد صاحب، چوہدری نسیم احمد صاحب، چوہدری ناصر احمد صاحب، میجر سعید احمد صاحب، چوہدری داؤد احمد صاحب، چوہدری سخی محمد صاحب، چوہدری مسعود بوٹا صاحب ہیں۔ آپ کی ساری اولاد بھی اپنے والدین کی طرح بہت ہی نیک اور ہمدرد ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو سدا خوش رکھے۔

خان میر خان صاحب مرحوم:

اونچے لمبے قد کے لمبے قدموں سے تیز تیز چلنے والے چُست و چوبند شخصیت تھے۔ آپ انتہائی ایماندار، نیک متقی پنج وقتہ نمازی، بزرگ اور چلتے پھرتے فرشتہ تھے۔ آپ رشتہ میں میرے پھوپھا جان لگتے تھے۔ قادیان میں کافی عرصہ حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ کے پرسنل باڈی گارڈ بھی رہے۔ آپ جب قادیان سے ربوہ تشریف لائے تو آپ نے غلہ منڈی میں ایک دودھ دہی کی دوکان کھولی۔ آپ ایک مثالی ایماندار دکاندار تھے۔ آپ کی دکان پر دودھ اور دہی مثالی ملتا تھا۔ آپ اپنی اولاد کو بھی ہر وقت ایمانداری کا ہی درس دیا کرتے تھے۔ آپ کے چھ بیٹے تھے جن کے نام بالترتیب حبیب اللہ خان صاحب مرحوم، رحمت اللہ خان صاحب، عبدالستار خان صاحب، محمد احمد صاحب شہید مرحوم، شیر احمد خان صاحب درویش مرحوم اور حمید اللہ خان صاحب مرحوم ہیں۔ آپ کی دو بیٹیاں ہیں۔

محمد رمضان صاحب حجام مرحوم:

غلّہ منڈی کے بہت ہی ہر دلعزیز حجام تھے۔ بہت ہی مذاقیہ طبیعت رکھتے تھے۔ نہایت ہی شریف، ایماندار اور نمازی انسان تھے۔ آپ کی دوکان غلّہ منڈی کے لنگر خانہ کے بالکل مقابل پر تھی۔ آپ بہت جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کی اولاد میں محمد سلطان صاحب میرے بہت جگری دوست تھے۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد سلطان کو دوکان کا چارج لینا پڑا۔ سلطان بھی اپنے باپ کی طرح بہت مذاقیہ طبیعت کا مالک تھا۔ سلطان بھی ایک اتفاقی حادثہ سے جلد اس دنیائے فانی سے

رخصت ہو گیا جس کا ہم دوستوں کو بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ورثاء کا حامی و ناصر ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔ آمین

عبدالسلام صاحب پان فروش:

غلّہ منڈی (رحمت بازار) کی رونق ایک پتلے دبلے لمبے قد کے ذرا جھک کر چلنے والی بہت پیاری شخصیت کے مالک تھے۔ نمازی، شریف النفس اور ہمدرد انسان ہیں۔ جماعتی کاموں میں ہمیشہ آگے رہنے والے اور جماعت کا درد رکھنے والے مجاہد ہیں۔ آپ کی غلّہ منڈی میں پان تمباکو اور سوڈا واٹر کی دوکان تھی۔ آپکی دوکان پر آپ کی اچھی طبیعت کی وجہ سے ہمیشہ رش رہا کرتا تھا۔ آپ منڈی کی ایک نمایاں شخصیت تھے اور ہیں۔

خواجہ محمد شریف صاحب مرحوم لاہور ہاؤس:

آپ قوم کے کشمیری تھے۔ بہت ہی نیک، ہنس مُکھ، نمازی اور بے حد ایماندار شخصیت تھے۔ آپ کی غلہ منڈی میں پرچون کی تھی۔ آپ کی دوکان غلہ منڈی میں چوہدری فرزند علی صاحب مرحوم کی آٹے کی چکی کے ساتھ تھی۔ آپکی وفات کے بعد آپ کے بڑے بیٹے محمد حنیف صاحب اس کو چلاتے رہے۔ اب اُن کی دکان اقصیٰ روڈ پر ہے۔

بھائی عبداللہ مرحوم برف بوتل والے:

آپ ہمارے ہمسایہ میں رہتے تھے۔ آپ نے اپنے گھر میں ہی گیس کی بوتلیں بھرنے کی ایک مشین لگائی ہوئی تھی۔ برف اور بوتل کا کاروبار کرتے تھے۔ نیک اور شریف انسان تھے۔ آپ کو شکار کا انتہائی حد تک شوق تھا۔ اور آپ کا بندوق کا نشانہ بلا کا تھا۔ اُڑتے ہوئے پرندہ کو مار گرایا کرتے تھے۔ نیز مچھلی کے شکار کے بھی بہت شوقین تھے۔ آپ ہمارے ساتھ بہت ہمدردی کا سلوک کرتے اس لئے ہم انہیں بھائی عبداللہ کہا کرتے تھے۔

عبدالحفیظ صاحب سبزی فروش:

ایک ہنس مکھ اور انتہائی مذاق طبیعت کے مالک۔ وہ ہمیشہ ہنسنے اور ہنسانے والے غلّہ منڈی کی ایک مثالی شخصیت تھے اور ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اُنہیں کسی بھی معاملہ میں کسی سے لڑتے یا جھگڑتے نہیں دیکھا۔ انتہائی ایماندار انسان ہیں۔ ہمارے بچپن کے زمانہ میں کبھی ہم دوست ان کی دوکان پر جاتے اور ان کے ڈھیروں مالٹے کھا کر کہتے بھائی حفیظ! ہم نے تو صرف چار مالٹے کھائے ہیں تو حفیظ صاحب ہمیشہ یہی کہتے کہ یار بارہ تو میں نے خود گنے ہیں بہرحال تم نے جتنے بھی پیسے دینے ہیں دیدو۔ لہٰذا آپ نے کبھی بھی زیادہ پیسے لینے کا اصرار نہیں کیا۔ خدا تعالیٰ ایسے پیارے وجودوں پر ہمیشہ اپنی رحمتیں برساتا رہے اور ان کی اولادوں کو بھی ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے اور ماں باپ کے نقشِ قدم پر چلائے۔ آپ کے علاوہ آپکے پانچ اور بھائی بھی ہیں جو کہ منیر احمد، سلطان احمد محبوب احمد، پنا اور ایک چھوٹا ہے۔ وہ بھی ماشاء اللہ اپنے اپنے طور پر غلّہ منڈی میں کاروبار کرتے ہیں۔

اللہ بخش صاحب مٹھائی والے:

آپ کا پہلے پہل غلّہ منڈی کی آٹے کی چکی کے سامنے ایک چھوٹا سا لکڑی کا کھوکھا ہوا کرتا تھا جس میں آپ مٹھائی کی دکان چلاتے تھے۔ اس کے بعد پھر آپ نے ایک بہت بڑی مٹھائی کی دوکان غلّہ منڈی میں ہی کھولی۔ آپ بھی غلّہ منڈی کے تمام دوکانداروں کی طرح محنتی، ایماندار اور ہمدرد انسان ہیں۔ بہت ہی شاکر اور صابر، نمازی، متقی اور پرہیز گار انسان ہیں۔ فی الحال لندن میں اپنے بیٹے منور احمد صاحب کے ہاں رہائش پذیر ہیں۔ آپکے چار بیٹے ہیں جن میں بالترتیب نسیم احمد، مبارک احمد، منور احمد (جن کی ماشاء اللہ ٹوٹنگ لندن میں ایک مٹھائی کی دکان ہے {پنجاب سویٹ ہاؤس}) اور مبشر احمد ہیں یہ سبھی ماشاء اللہ لندن میں برسرِ روزگار ہیں۔

فتح محمد صاحب لائل پوری مرحوم:

بہت ہی ہنس مکھ اور ایک ایماندار محنتی انسان تھے۔ آپ بھی غلہ منڈی کی رونق تھے۔ آپ کی غلّہ منڈی میں پرچون کی دوکان تھی۔ مجھے ابھی بھی ان کا مسکراتا ہوا چہرہ یاد ہے جب مجھے کہا کرتے تھے کہ حسن اب تمہارے ذمہ کافی بقایا ہوگیا ہے، ادا کردو۔ کیونکہ ہم نے آپ کی دوکان پر اُدھار لگوایا ہوا تھا۔ آپ سب دوکانداروں میں ایک چیز جو نمایاں تھی وہ اپنے گاہکوں سے اچھا رویّہ تھا جو وہ اپنے گاہکوں سے روا رکھتے تھا۔ ہنس کر بات کرنا سب میں قدرِ مشترک تھا۔ نیز سچائی اُن سب دکانداروں کا شیوہ تھا۔ میں نے کبھی بھی ان کو اپنے گاہکوں سے لڑتے نہیں دیکھا۔ سب ہی انتہائی حلیم طبیعت رکھنے والے فرشتہ صفت تھے۔

سیٹھ محمد دین صاحب مرحوم:

ہمارے ہمسایہ میں رہتے تھے۔ میں نے اُنہیں ہمیشہ نئے کپڑوں میں چاق وچوبند دیکھا۔ آپ کا چہرہ ہمیشہ نیکوں کی طرح کھلا رہتا تھا۔ آپ آڑھت کا کام کرتے تھے۔ آپ نیک متقی اور پنج وقتہ نمازی تھے۔ آپ کے بیٹے منیر احمد صاحب غلّہ منڈی میں پرچون کی دکان چلاتے تھے جو آجکل بلیک پول انگلستان میں صاحبِ فراش ہیں۔ آپ کی ساری اولاد اپنے باپ کی طرح جماعت کی سچی فدائی ہے۔ آپکے بڑے بیٹے بشیر احمد صاحب اختر ایک عرصہ تک سیرالیوں میں جماعت کے سکول میں پڑھاتے رہے ہیں اور اب خدا کے فضل سے یوکے جماعت کے جنرل سیکریٹری ہیں۔ باقی سعید احمد صاحب اور وحید احمد صاحب بھی جماعت کے کاموں میں ہمیشہ مستعد اور فعال رہتے ہیں۔

فیاض احمد خان صاحب کرمانی:

فیاض ٹی سٹال والے۔ آپ کی چائے اور دودھ دہی کی دوکان خان میر خان صاحب مرحوم کی دوکان کے پاس ایک تھڑے کے اُوپر ہوا کرتی تھی۔ آپ بھی نیک وصالح، نمازی اور ایماندار انسان تھے۔ حالات اگرچہ کافی مخدوش اور پتلے تھے مگر آپ بھی بہت صابر اور شاکر اور پکے مومن تھے۔ آپ کی دکان پر بھی یار دوستوں کی کافی محفلیں جما کرتی تھیں۔

عبداللہ جان صاحب مرحوم سبزی فروش:

آپ بھی غلّہ منڈی کی ایک رونق تھے۔ ہمیشہ اپنی دوکان سے ہی اونچی آواز سے مذاق کیا کرتے تھے۔ بہت ہی مذاحیہ طبیعت رکھتے تھے۔ اورقوم کے کشمیری تھے۔ میرے بہت ہی پیارے اورلنگوٹیا دوست شیخ محمد یونس کی زمین میں آپکی سبزی کی دکان ہوا کرتی تھی۔ آپ بھی بہت ہی نیک اور نمازی اورایک ہمدرددل رکھنے والے انسان تھے۔ آپ کے ایک بیٹے بشارت احمد صاحب ابھی بھی غلہ منڈی میں سبزی کی دوکان لگاتے ہیں۔

نعمت اللہ صاحب۔ نعمت ٹی سٹال:

غلّہ منڈی کی پچھلی جانب لکڑی کے کھوکھے میں ایک چھوٹی سی چائے اوردودھ دہی کی دکان ہے۔ جہاں پر یاردوستوں کا ہروقت رش ہی رہتا ہے۔ آپ بھی بہت خوش مزاج اورنہات شریف النفس انسان ہیں۔ آپ کے ایک بیٹے محمد صادق صاحب ہیں۔

عبدالکریم صاحب پہلوان جی:

آپ ایک زمانہ میں پہلوانی کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ کا نام ہی پہلوان پڑ گیا۔ آپ ہمیشہ سفید کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے۔ آپ بھی بہت ہی ہنس مکھ اورمذاحیہ طبیعت کے تھے۔ نمازوں کے بہت پابنداورایماندارانسان تھے۔ آپ غلّہ منڈی میں لکڑی کا کام کرتے تھے۔ لکڑی کی کُھرلیں بنا کر بیچا کرتے تھے۔ آپ کے دو بیٹے ہیں۔

معراج دین صاحب مرحوم:

آپ کی پرچون کی دوکان فتح محمد صاحب لائل پوری مرحوم کی دوکان کے ساتھ تھی۔ آپ بہت ہی ہنس مکھ اورعظیم انسان تھے۔ آپ بھی غلّہ منڈی کی ایک رونق تھے۔ نہایت ایماندار اورمحنتی انسا ن تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند اوراسی طرح آپ کی اولاد بھی نیک اور جماعت کی سچی فدائی ہے۔ آپ

کچھ عرصہ انگلستان میں بھی رہے اوریہیں پر وفات پائی۔

احمد خان صاحب:

آپ کا غلّہ منڈی میں ایک چھوٹا سا ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ آپ بہت محنتی اور مضبوط قوائی کے مالک تھے اور ہیں۔ آپ اب جرمنی میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہائش رکھتے ہیں۔ آپ کے ایک بڑے بھائی جن کا نام محمد خان صاحب ہے، ربوہ میں ابھی تک ہوٹل چلاتے ہیں اور کبھی کبھار آپ مرغیاں ذبح کر کے غلّہ منڈی میں بیچتے ہیں۔ آپ بھی بہت محنتی اور شریف النفس اور ہمدرد انسان ہیں۔

چودھری غلام احمد صاحب مرحوم آڑھتی:

آپ کی پرچون کی دوکان اور مکان غلّہ منڈی میں ہوا کرتا تھا۔ بہت ہی محنتی اور نمازی اور نیک اور ہمدرد انسان تھے۔ آپ کی اہلیہ صاحبہ مرحومہ بھی بہت ہی نیک اور ملنسار خاتون تھیں۔ آپ کی اولاد خدا کے فضل سے بہت نیک اور جماعت کی فدائی ہے۔ آپ کے بیٹے حمید احمد صاحب، بشارت احمد صاحب، بشیر احمد صاحب اعوان، محمد احمد صاحب اور محمود احمد صاحب ہیں۔ بشیر احمد صاحب اعوان حال فرانس میرے جگری دوستوں میں سے ہیں جن کے ساتھ ربوہ میں سارا بچپن گزرا۔

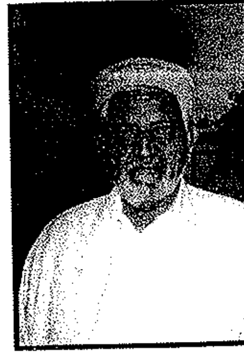
عبداللہ صاحب سائیکل والے:

آپ کی سائیکلوں کی مرمت اور کرایہ کی دوکان غلّہ منڈی میں ہوا کرتی تھی۔ جہاں سے ہم ہمیشہ کرایہ پر سائیکلیں لیا کرتے تھے۔ آپ بھی بہت ہی شریف اور سادہ سے انسان تھے۔ مجھے یاد ہے جب کبھی ہمیں سائیکل لئے بہت دیر ہو جاتی اور کرایہ بھی بہت چڑھ جاتا تو پھر بہانے ڈھونڈھنے کہ کیسے بھائی عبداللہ کو ٹرخایا جائے۔ پھر ہم نے اس تاڑ میں رہنا کہ کب بھائی عبداللہ کی توجہ کسی اور طرف ہو تو ہم اُن کی سائیکل واپس پھینک کر بھاگ جائیں۔ جب کبھی اُن کو علم ہو جانا تو پھر بھائی عبداللہ نے ہمارے پیچھے بھاگنا۔ مگر بھائی عبداللہ بھی عظیم انسان تھے۔ ہماری گستاخی پر زیادہ دیر ناراض نہیں رہا

کرتے تھے۔ پھر جلد ہی ہمیں دوبارہ سائیکل کرایہ پر دے دیا کرتے تھے۔آپ کے بیٹے عبدالشکور صاحب بھی اپنے باپ کے ساتھ کافی عرصہ اس دکان کو چلاتے رہے۔

غلام احمد صاحب پان اور سگریٹ فروش:

آپ ہمارے ہمسایہ میں رہتے تھے۔نہایت ہی شریف اور سیدھے سادھے کھری بات کہنے والے ملنسار انسان ہیں۔نمازوں کے پابند اور بہت ہی ایماندار سخت محنتی انسان تھے۔آپ ایک حادثہ میں اپنے ایک بازو سے کافی حد تک معذور بھی ہو گئے مگر آپ اُس حالت میں بھی اپنے بال بچوں کی خاطر اپنے اُس کام میں دھنی رہے۔آپ کی اہلیہ بھی ہم سے بہت پیار کا سلوک کرتی تھیں۔میرا اور میری ہمشیرگان کا اُنکے گھر ہمیشہ آنا جانا رہا کرتا تھا۔ہم نے اُن دونوں کو ہمیشہ اپنے ہمدرد ہی پایا۔آپ کے بیٹے بھی اپنے باپ کی طرح ماشاء اللہ بہت ہی نیک وصالح اور ملنسار ہیں۔آپ آجکل جرمنی میں اپنے بیٹے منظور احمد کے ساتھ رہائش رکھتے ہیں۔



ٹھیکیدار علم دین صاحب مرحوم:

آپ کا ایک لکڑی کا آرا تھا جو کہ مسجد ناصر کی پچھلی جانب تھا۔آپ نیک بزرگ اور جماعت کے فدائی تھے۔آپ بہت ہی خاموش طبع انسان تھے۔آپ کے تین بیٹے ہیں محمد رمضان صاحب حال جرمنی، سلیمان احمد صاحب طاہر حال انگلستان اور ایک بیٹا عثمان احمد صاحب حال ناروے ہیں۔

چوہدری عبدالکریم صاحب مرحوم:

آپ کی دودھ دہی کی دکان گول بازار میں تھی۔آپ رشتہ میں میرے بہنوئی لگتے تھے۔آپ کی بیگم میری خالہ زات بہن تھیں۔آپ نہایت شریف اور سیدھے سادھے انسان تھے۔آپ اُونچے

لمبے قد کے ہمیشہ سفید کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے۔میرے ساتھ بہت پیار کا سلوک کرتے اور بڑی شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔آپ کے ماشاء اللہ چھ بیٹے تھے۔جن میں چوہدری عبدالرشید صاحب اور چوہدری عبدالسلام صاحب جرمنی میں رہتے ہیں۔ باقی چوہدری عبدالرحیم صاحب، چوہدری عبدالمجید صاحب اور چوہدری عبدالمنان صاحب ربوہ میں رہتے ہیں۔ایک بیٹا عبدالشکور صاحب جو کہ بہت سی نیک صفات کا مالک تھا جرمنی سے چھٹیوں پر پاکستان گیا تو وہاں پنڈی بھٹیاں کے قریب لاہور سے ربوہ آتے ہوئے ایک بس کے حادثہ میں جان بحق ہو گیا تھا۔

آپ کا ذکر غلّہ منڈی کے دوکانداروں میں اس لئے دیا گیا ہے کہ آپ بمع اپنی فیملی کے ہمارے گھر غلّہ منڈی میں کئی عرصہ تک رہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد صاحب:

آپ ملٹری کے ریٹائرڈ ڈاکٹر تھے۔آپ کی دوکان خواجہ محمد شریف صاحب مرحوم کی دوکان کے ساتھ تھی۔درمیانہ قد کے نیک صفت اور انتہائی نیک اور ہمدرد انسان تھے۔

محمد شریف صاحب مرحوم باربردار:

آپ بہت ہی پیاری شخصیت تھے۔ابھی بھی مجھے ان کی مسکراہٹ یاد ہے جو ان کے چہرہ پر ہر وقت نمایاں رہا کرتی تھی۔میں نے آپ کو ہمیشہ چاق وچوبند پایا اور کام ہمیشہ بھاگ بھاگ کر کیا کرتے تھے۔آپ کے پاس ایک گدھا تھا جس کو باربرداری کے کام میں لایا کرتے تھے۔

آپ کے ایک بیٹے محمد صادق صاحب انگلستان میں رہتے ہیں۔

سیف علی صاحب مرحوم باربردار:

آپ قوم کے کشمیری تھے۔ہمارے ہمسایہ میں رہتے تھے۔بہت ہی نیک اور ہمدرد انسان تھے۔آپ کافی عرصہ سید ولایت حسین شاہ صاحب مرحوم کے گھر میں کرایہ پر رہے۔خاکسار ہمیشہ آپ

کے گھر جایا کرتا تھا۔آپ بہت ہی مہمان نواز تھے ۔ جب بھی میں ان کے گھر جاتا کھانا ضرور کھلا کر جانے دیتے ۔آپ لاری اڈہ میں جاکر محنت مزدوری کیا کرتے تھے۔آپ کا صرف ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام محمد صادق صاحب ہے جوکہ میرا بہت ہی عزیز دوست ہے۔

کچھ اپنے بارہ میں

خاکسار کے والد ماجد کا نام سید بازید خان (آف افغانستان) مرحوم ہے ۔

احمدیت قبول کرنے سے قبل آپ سوات میں جنگلات کے محکمہ میں افسر بھی رہے۔احمدیت قبول کرنے کے بعد آپ کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا بالآخر آپ کو وہاں سے ہجرت کرنی پڑی۔ اور ہجرت کر کے آپ قادیان تشریف لائے جہاں آپ کی شادی حضرت سید احمد نور صاحبؓ مرحوم کی بیٹی سے ہوئی۔آپ کی فیملی میں سے صرف آپ کی بڑی ہمشیرہ صاحبہ مرحومہ کو ہی احمدیت قبول کرنیکی توفیق حاصل ہوئی۔آپ نے اپنی باقی ماندہ زندگی قادیان میں ہی گذاری اور یہیں پر آخر وفات پائی۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔



بچپن سے ہی باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد میرا سارا عرصہ ربوہ میں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ گزرا۔ میری ہوش کے زمانہ میں میری والدہ مرحومہ عموماً بیمار ہی رہا کرتی تھیں۔

الحمدللہ کہ خدا تعالیٰ نے مجھے کافی لمبا عرصہ اپنی پیاری ماں کی خدمت کا موقع عطا کیا۔آپ انتہائی صبر وشکر کرنے والی خاتون تھیں ۔ جوانی میں ہی آپ بیوہ ہوگئی تھیں اور آپ کی ساری زندگی بیوگی میں ہی گذری مگر کبھی بھی میں نے آپ کے منہ سے شکوہ کا ایک لفظ تک نہ سُنا ۔ بیماری سے اُٹھتیں تو ہمارے محلّہ کی لجنہ کی میٹنگز میں بڑی باقاعدگی سے جایا کرتی تھیں۔ آپ کی صرف ایک ہی سہیلی تھیں جن کے پاس آپ عموماً جایا کرتی تھیں۔ وہ حضرت آپا عزیزہ صاحبہ

مرحومہ حرم حضرت مصلح موعودؓ ،(والدہ ماجدہ صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب امیر جماعت احمدیہ ہندوستان) تھیں۔ حضرت آپا عزیزہ کے گھر آپ کئی کئی دن رہا کرتی تھیں۔ اور حضرت آپا عزیزہ کو بھی آپ سے اتنی محبت تھی کہ چند دن اوپر ہو جاتے تو نوکر کو ہمارے گھر بھجواتیں کہ جاؤ جاکر مریم بیگم کو میرے پاس لے آؤ۔



خاکسار کا سارا بچپن اور جوانی ربوہ میں ہی گزرا۔ ۱۹۷۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم اور روزگار کی خاطر سن ۱۹۷۲ میں خاکسار انگلستان آگیا ۔ ۱۹۷۴ء میں خاکسار کی شادی چوہدری محمد نذیر صاحب باجوہ مرحوم کی بیٹی سے ہوئی ۔ میرے سسر مرحوم دُعاگو، تہجد گزار اور بہت ہی نیک بزرگ تھے۔آپ بہت ہی سادہ طبیعت رکھتے تھے۔اپنی بیٹی کے گھر آتے تو گھنٹوں بیٹھے رہتے اور کہا کرتے تھے کہ مجھے اس گھر میں آکر دلی سکون ملتا ہے۔خاکسار سے بہت ہی شفقت اور اپنے بیٹوں سے بڑھ کر سلوک کیا کرتے تھے۔ میں اس لئے بھی اپنے آپ کو بہت ہی خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے سسر مرحوم نیز ساس صاحبہ دونوں انتہائی نیک، سادے اور دُعا گو دیئے ہیں۔





خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے خاکسار کو ایک بیٹی اور دو بیٹوں سے نوازا ہے۔ میرے بڑے بیٹے کا نام سید انصر جاوید خان ہے اور دوسرے بیٹے کا نام سید زین العابدین گُل خان ہے۔میرے دونوں بیٹے ماشاءاللہ نمازی، نیک صفت اور جماعت کی بڑھ چڑھ کر خدمت کرنے والے ہیں۔

اپنی بیماری کے بعد زیادہ عرصہ خاکسار کو مارڈن جماعت اور بیت الفتوح میں سلسلہ کی خدمات بجالانے کی توفیق مل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے آئیندہ بھی مقبول اور احسن رنگ میں جماعت کی توفیق دیتا چلا جائے۔ آمین

آخر میں احباب جماعت کی خدمت میں درخواستِ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے خاکسار کو نیز میری اولاد دراولاد کو سلسلہ عالیہ احمدیہ سے منسلک رکھے اور خلافت سے وابستہ اور اسکی برکات سے مستفیض ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین

والسلام

خاکسار سید حسن خان آف مچم سرے۔ یوکے